بہترین بنگالی ناولوں کے تراجم کا سلسلہ ۱

دیہاتی سماج

بنگال کے عظیم المرتبت ادیب شرت چندر چیٹرجی کے ناول "پلی سماج" کا اردو ترجمہ

از قلم

حضرت یزدانی جالندھری

سول ایجنٹ

میسرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز اندرون لوہاری دروازہ لاہور

پبلشرز

عبدالرحمن، عنایت اللہ تاجران کتب ہال بازار

امرتسر

راما آرٹ پریس سنتوکھ سر امرتسر میں باہتمام رام ناتھ پرنٹر چھپا

بار دوئم   ۵۰۰   قیمت دو روپیہ ۸

ہندوستان کی چھتیس کروڑ دیہاتی آبادی

کے

نام!

بیڑوانی

پیرایۂ آغاز

شرت چندر کا نام اب اُردو ادب کے لئے نیا نہیں رہا۔ ان کے بعض ناول اُردو میں منتقل ہو کر ہمارے دلوں پر شرت بابو کا سکہ بٹھا چکے ہیں۔ بنگال کے ادیبوں میں تین نام ایک ساتھ لئے جاتے ہیں۔ بنکم، ٹیگور اور شرت۔ لیکن میری رائے میں انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی اور کردار نگاری میں جو درجہ شرت کو حاصل ہے وہ بنکم بابو یا ٹیگور کو حاصل نہیں۔

شرت بابو سے پہلے کا بنگالی ادب آزاد اور مؤثر نہ تھا۔ بنکم بابو نے دھرم اور اصول کو ہمیشہ بلند مقام دیا۔ انہوں نے ہر جگہ یہ ثابت کیا کہ برائی پر نیکی کی فتح ہوتی ہے۔ بنگال کے متوسط طبقہ نے اس قسم کے ناولوں کو بے حد پسند کیا۔ ان میں سماجی بندشوں کو توڑنا نقصان دہ ثابت کیا گیا تھا۔

لیکن غربت و افلاس کے آنسو بہت دن تک لوگوں کی نگاہ سے چھپے نہیں رہتے انہیں بھی دنیا کو اپنی کہانی سنانے کا موقعہ مل ہی جاتا ہے چنانچہ شرت کے قلم نے غریب و مفلوک الحال پسماندہ طبقہ کے غم و آلام کو مصور کیا۔ انہوں نے سماج کے دونوں متوسط اور پسماندہ طبقے کے لوگوں کی زندگی میں قدم رکھ کر ان کے فرق و امتیاز کو واضح کیا۔

شرت نے سچائی، غیر جانبداری سے انسان کی تصویر کشی کی ہے۔ ایک عظیم فن کار کو روح اور احساسات کے بارے میں سچائی کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ شرت نے انسانی فطرت پہ زیادہ زور دے کر اس کی کمزوریوں کی طرف محض اشارات ہی کئے ہیں۔ ہندوستان میں صرف ایک ناول نگار سے شرت بابو کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ

ہے منشی پریم چند۔ اگرچہ شرت کا میدان اتنا وسیع نہ تھا۔ جتنا منشی پریم چند کا کیونکہ ٹیگور کی طرح شرت کبھی گھر سے باہر نہیں جاتے۔ ملک کے سیاسی اضطراب کا ان کے دل پر کوئی اثر نہیں پڑا لیکن اپنے چھوٹے ہی میدان میں انہوں نے ہندوستانی خصوصاً بنگالی سماج کی پوری پوری ترجمانی اور عکاسی کی ہے۔ انہوں نے پسماندہ طبقہ کو آگے بڑھایا ہے اور یہ ثابت کیا ہے۔ کہ شہریوں کے مقابلے میں دیہاتی زیادہ حق پرست ہوتے ہیں۔

ناول "پلی سماج" (دیہاتی سماج) میں تو شرت بابو اپنے پورے عروج پر ہیں۔ اس ناول میں انہوں نے دیہاتی زندگی کا نہایت دلدوز نقشہ کھینچا ہے۔ ان سیدھے سادے لوگوں کے اندھے عقائد اور جہالت کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی ہے۔ ایک ہی خدا کی مخلوق ہو کر اور ایک ہی خدا بخشی ہوئی فطری نعمتوں کے حق دار ہو کر بھی انسان انسان میں کتنا فرق ہے کتنا امتیاز ہے! کہاں ہیں ان کے لئے موجودہ سائنس کے پیدا کئے ہوئے آسائش و راحت کے سامان؟ دنیا میں پیدا ہو کر اور سچی محبت کے آنسو بہا کر وہ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے جاتے ہیں یہ ہے ان کی زندگی!

"دیہاتی سماج" میں رمیش ایک بیوہ لڑکی رما سے محبت کرتا ہے۔ ہندو سماج کی نگاہ میں یہ پاپ ہے لیکن شرت بابو تو رائے عامہ کو ٹھکرا کر اندھے سماج کی آنکھیں کھولنا چاہتے تھے۔ یہ کتاب پڑھ کر سینکڑوں لوگوں کا دل کھل گیا اور سب نے یک زبان ہو کر کہا "شرت واقعی شیلا لکھتے ہیں"

امید ہے اُردو داں طبقہ شرت بابو کے اس بہترین ناول کی قرار واقعی قدر کرے گا۔

میں مسٹر بلراج سہگل پروپرائٹر میسرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز کا ممنون ہوں کہ انہوں نے شرت کے اس ناول کی اشاعت کا ذمہ لیکر مجھے اس شاہکار ادب کو پیش کرنے کا موقعہ دیا۔ کاغذ کی اس ہمت شکن و حوصلہ فرسا گرانی کے زمانے میں ان کا یہ اقدام ایک قابل قدر ادبی ایثار ہے۔ جس کے لئے وہ صرف میرے ہی نہیں بلکہ تمام ادب نواز حضرات کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

لاہور ۱ جنوری سنہ ۶۲ء　　　　　　یزدانی جالندھری

(۱)

دینی گھوشال نے جیسے ہی سرجو کے مکان کے صحن میں قدم رکھا، سامنے سے ایک ادھیڑ عمر عورت آتی دکھائی دی انہوں نے کہا "یہ تو موسی ہیں، رما کہاں ہے؟"

موسی اس وقت پوجا کر رہی تھیں، انہوں نے رسوئی گھر کی طرف اشارہ کر دیا۔ دینی نے رسوئی گھر کے دروازے پر پہنچ کر کہا "کیوں رما! تم نے کچھ فیصلہ کیا کہ کیا کروگی؟"

جلتے ہوئے چولھے پر سے بڑبڑاتی ہوئی کڑاہی اتار کر زمین پر رکھتے ہوئے رما نے اٹھا کر دیکھا اور پوچھا۔

"بھیا! کس بارے میں؟"

دینی نے کہا "بہن ابھی تارنی چچا کے شرادھ کے بارے میں۔ رمیش تو کل یہاں آپہنچا۔ معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے باپ کا شرادھ خوب دھوم دھام سے کریگا۔ تم جاؤگی یا نہیں؟"

رما نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا "میں جاؤنگی؟ — تارنی گھوشال کے گھر؟"

دینی نے شرمندہ سا ہو کر کہا "ہاں بہن! یہ تو میں بھی جانتا ہوں — اور خواہ

جو ہو، لیکن تم لوگ وہاں کسی طرح نہ جاؤگی۔ لیکن سنا ہے کہ وہ خود سب لوگوں کے یہاں جاکر بات چیت کرے گا۔ کمبخت عقل میں تو اپنے باپ پر ہی گیا ہے اگر وہ تمہارے یہاں آیا تو تم کیا کہو گی؟"

ترنا نے بگڑ کر جواب دیا: "میں کیا کہوں گی! دروازے پر دربان ہی اسے جواب دے دے گا۔"

پوجا میں مصروف موسی کے کانوں میں جب گروہ بندی کی یہ باتیں پہنچیں تو وہ پوجا پاٹھ چھوڑ کر وہاں آ پہنچیں۔ ابھی ان کی بھانجی کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ وہ گرم گرم دھان کی کھیل کی طرح چٹک کر بولیں "دربان کیوں کہنے لگا میں کیا کہنا نہیں جانتی؟ اس بدمعاش کو تو میں ایسی کھری کھری سناؤں گی۔ کہ پھر کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھے گا۔ تارنی گھوشال کا لڑکا دعوت دینے آئے گا؟ —— ہمارے گھر؟ دیکھی مادھوا! میں کوئی بات بھولی نہیں ہوں۔ تارنی اپنے اسی لڑکے کے ساتھ ہماری ترنا کا بیاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک ہمارے جتندر کی پیدائش نہ ہوئی تھی۔ تارنی نے سوچا تھا کہ یہ شادی ہو جانے پر یادو ناتھ مکرجی کی تمام دولت جائداد ہماری مٹھی میں آجائے گی۔ سمجھ گئے نا بیٹا دیکھی! لیکن جب وہ بیاہ نہیں ہوا تو اسی بھیرد آچاریہ سے نہ جانے کتنے جپ تپ اور ٹونے ٹوٹکے کرا کے اس نے میری بیٹی کی قسمت میں ایسی آگ لگادی کہ چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ میری بچی کے ہاتھ کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں اور ماتھے کا سیندور پونچھ گیا۔ چھوٹی ذات کا ہو کر چاہتا تھا یادو ناتھ مکرجی کی لڑکی کو بیٹی بہو بنانا! پاجی کی موت بھی ویسی ہی ہوئی۔ لڑکے کے ہاتھ کی آگ تک نصیب نہ ہوئی تا آنکہ سکے چھوٹی ذات کے منہ میں۔"

یہ کہہ کر موسی ہانپنے لگیں، جیسے کسی سے کشتی لڑی ہو۔ بار بار چھوٹی ذات چھوٹی ذات سن کر دیپی کا چہرہ بھی اتر گیا۔ کیونکہ تارنی گھوشال آخر اس کے چچا ہی تھے۔

رتنا نے یہ دیکھ کر موسی کو قدرے پھٹکارتے ہوئے کہا "کیوں موسی! تم کسی کی ذات کے بارے میں اس طرح کی باتیں کیوں کرتی ہو؟ ذات تو کسی کے ہاتھ کی گھڑی ہوئی چیز نہیں جس کی پیدائش جس ذات میں ہوئی ہو، اس کے لئے وہی ذات اچھی ہے۔"

وتینی نے قدرے ندامت آمیز لہجے میں کہا "نہیں رتنا موسی نے جو کچھ کہا ہے، ٹھیک ہی کہا ہے بہن، تم اتنے بڑے ذات کے گھرانے کی لڑکی ٹھہریں بھلا تمہیں ہم لوگ اپنے گھر لا سکتے ہیں؟ چھوٹے چچا کا اس طرح کی بات اپنی زبان پر لانا ہی بے ادبی تھا۔ اور جو لڑنے لڑنے کی بات کہتی ہو، وہ بھی درست ہی ہے۔ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں جو چھوٹے چچا، اور یہ بدبخت بھیرداتا یہ نہ کر سکتا ہو۔ یہی بھیرو آج کل رینش کا مربی بنا ہوا ہے۔"

موسی نے کہا "ہاں وتینی! یہ تو سمجھی بوجھی ہوئی بات ہے، دس بارہ برس سے تو وہ دیش میں آیا نہیں آخر اتنے دنوں تک وہ تھا کہاں؟"

وتینی نے کہا "موسی! بھلا مجھے کیا معلوم؟ چھوٹے چچا کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ تم لوگوں کا تھا، ویسا ہی ہم لوگوں کا بھی تھا۔ سنتا ہوں کہ اتنے دنوں تک وہ بمبئی یا اور کہیں تھا۔ کوئی کہتا ہے، وہ ڈاکہ زنی پاس کر کے آیا ہے، کوئی کہتا ہے وکیل بن کر آیا ہے ـــــ اور کوئی کہتا ہے یہ سب فریب ہے۔ کیونکہ لنڈا ہی شرابی ہے۔ جب گھر آگر رہتا تو اس کی آنکھیں گڑھل کے پھول کی طرح سرخ رہتیں۔"

موسی نے کہا "یہ بات ہے؟ جب تو اسے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دینا چاہیئے۔"

وتینی نے جوش سے سر ہلا کر کہا "کبھی قدم نہیں رکھنے دینا چاہیئے۔ کیوں رتنا! نہیں رینش تو یاد ہے نا؟"

اپنی خستہ نصیبی کا تذکرہ چھڑنے پر رتنا دل ہی دل میں نادم ہو رہی تھی۔ اسی شرمگین انداز سے مسکراتی ہوئی بولی "یاد کیوں نہیں۔ مجھ سے کچھ بہت بڑے

تو میں نہیں اور پھر شنشیلا تلے والے مدرسے میں ہم لوگ اکٹھے ہی پڑھا کرتے تھے۔ لیکن ماں، انکی ماں کا مرنا مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ چچی مجھے بہت مانتی تھیں۔"

موسی ایک بار پھر ناچ کر بولیں "ٹھگ تھی اس کے ماننے میں سو مان منافقی خالی اپنا کام نکالنے کے لئے تھا۔ اُن لوگوں کا مطلب ہی تھا کسی طرح تمہیں اپنے ہاتھ میں کرنا۔"

رتینی نے واقف حالات کی طرح ہنکارا بھرتے ہوئے کہا "اس میں کیا شک ہے۔ چچوڑی تھی بھی . . . !"

لیکن اتھیں اس کی بات مکمل بھی نہ ہو سکی تھی۔ کہ رتنا ناراض ہو کر موسی سے کہنے لگی۔ "موسی! اب ان پرانی باتوں کو دہرانے کی کیا ضرورت ہے!"

رتیش کے باپ سے چاہے کتنا ہی جھگڑا کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کی ماں کے بارے میں رتنا کے دل کے کسی کونے میں چھپی ہوئی ہمدردی تھی۔ رتینی نے فوراً تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں، ہاں، یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ چھوٹی چچی بہت بھلے گھر کی لڑکی تھیں۔ آج بھی اگر ان کی کوئی بات چھڑتی ہے تو میری ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔"

جب رتینی نے دیکھا کہ بات کہیں کی کہیں پہنچ رہی ہے تو انہوں نے فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہا "لیکن بہن! ابھی ٹھیک۔ رہا نا؟ اب اس میں کوئی ردوبدل تو نہ ہوگا نا؟"

رتنا ہنسی اور اس نے کہا "بھیا! بابوجی کہا کرتے تھے۔ کہ بیٹی آگ، قرض اور دشمن کا کچھ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہیئے۔ تارنی گھوشال جب تک زندہ تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو کم نہیں ستایا۔ انہوں نے تو ہمارے بابوجی تک کو جیل بھجوانا چاہا تھا۔ بھیا میں کوئی بات بھولی نہیں ہوں اور جب تک زندہ رہوں گی، اس وقت تک بھول بھی نہیں سکتی۔ رتیش ہمارے اس دشمن کے لڑکے ہیں نا! اور پھر میں تو کسی طرح چاہتی نہیں

سکتی۔ باپو جی ہم دونوں بھائی بہن میں جائیداد تقسیم تو کر گئے ہیں، لیکن سب کا بندوبست کرنا تو میرے ہی ذمے ہے۔ ہم لوگ تو نہیں جائیں گے۔ بلکہ جن لوگوں کے ساتھ ہم لوگوں کا کوئی تعلق ہے انہیں بھی ہم لوگ تو نہیں جانے دینگے۔ دیپر کچھ سوچ کر کہا ــــ کیوں بھیا ہم کوئی ایسا انتظام نہیں کر سکتے کہ کوئی برہمن ان کے گھر نہ جائے؟"

دینی کچھ اور آگے کھسک آئے اور ذرا دھیمے لہجے میں کہنے لگے "بہن! بس اسی بات کی تو میں کوشش کر رہا ہوں۔ اگر تم میری پشت پر رہو تو پھر مجھے اور کسی بات کی فکر نہیں۔ اگر میں رمیش کو اس "کندا پور" گاؤں سے نہ بھگادوں تو میرا نام دینی گھوشال نہیں۔ پھر رہ جاؤں گا میں اور یہ بھیرو آچاریہ! اب تارنی گھوشال تو ہیں نہیں پھر دیکھونگا کہ اس سالے کو کون بچاتا ہے؟"

رما نے کہا "یہ بچا ہیں گے رمیش گھوشال! دیکھو بڑے بھیا! میں کہے دیتی ہوں۔ کہ دشمنی میں یہ بھی کسی سے کم نہ کرینگے۔"

دینی اب کچھ اور بھی آگے کھسک آئے اور ذرا ادھر اُدھر دیکھ کر جو کھٹ پر جم کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی آواز اور بھی دھیمی کر کے کہا "اگر تم اُنس کو بنانا چاہتی ہو تو بس یہی وقت ہے۔ یہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں لیکن جب وہ پک جائیگا تو پھر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ ابھی تک اس نے یہ نہیں سیکھا ہے کہ دھن دولت اور زمین جائداد کس کس طرح حفاظت کی جاتی ہے۔ اب اگر اسی دوران میں دشمن کو تباہ نہ کر دیا جائیگا تو آئندہ چل کر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ یہ بات تمہیں دن رات یاد رکھنی پڑے گی کہ اور کوئی نہیں تارنی گھوشال کے لڑکے ہیں یہ!"

رما نے کہا "بڑے بھیا! یہ تو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

دینی نے کہا "بہن! بھلا ایسی کونسی بات ہے جو تم نہ سمجھتی ہو۔ بھگوان نے تو تمہیں لڑکا بنانے بنانے لڑکی بنا دیا۔ ہم لوگ تو انہیں میں اکثر کہا کرتے ہیں کہ

سمجھ بوجھ ہیں اچھے زمیندار بھی تمہارے سامنے کوئی چیز نہیں اچھا تو میں کل پھر کسی وقت آؤں گا۔ آج دیر ہو رہی ہے اب میں جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر دینی گھوشال اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی اس تعریف سے رما بڑی خوش ہوئی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دینی سے کچھ اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ صحن کے ایک طرف سے کسی اجنبی آدمی کی مہین آواز سنائی دی۔

"ارے رانی کہاں ہے؟"

جب رما چھوٹی تھی تو رمیش کی ماں اُسے اسی نام سے پکارا کرتی تھی۔ لیکن اتنے دن گزر جانے پر اب وہ خود بھی یہ بات بھول گئی تھی۔ اس نے دینی کی طرف دیکھا کہ اس کے تمام چہرے پر سیاہی پھیل گئی ہے۔ اتنے میں خشک بال بکھرائے ننگے پاؤں اور دوپٹہ لپیٹے رمیش اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

دینی پر نگاہ پڑتے ہی وہ بولے "ارے یہ تو بڑے چچا ہیں! آپ یہاں کہاں آ گئے؟ آپ وہاں نہ ہوں گے تو سب کام کرے گا کون؟ میں تو گھنٹوں سے آپ کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ رانی کہاں ہے؟"

یہ کہتے ہوئے رمیش کھڑکی کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ اس وقت رما بھاگ تو سکتی نہ تھی۔ اس لئے سر جھکا کر چُپ چاپ کھڑی رہی۔ رمیش نے لمحہ بھر تک اس کی طرف دیکھ کر متحیرانہ لہجے میں کہا "ارے واہ، تم تو اتنی بڑی ہو گئیں! اچھی طرح تو ہو؟"

رما سر جھکائے کھڑی رہی اس طرح اچانک رمیش کے آ جانے کے باعث وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ رمیش نے ہنستے ہوئے پوچھا "پہچانتی تو ہو نہ؟ میں تمہارا رمیش بھیا ہوں۔"

لیکن رتنا اب بھی اس کی طرف سر اٹھا کر نہ دیکھ سکی۔ ہاں ادھم بیچ میں اس نے پوچھا "آپ اچھے ہیں؟"

"ہاں، بالکل اچھی طرح ہوں" رمیش نے کہا "لیکن رتنا تم مجھے "آپ" کیوں کہتی ہو؟"

پھر دینی کی طرف دیکھ کر اور غم آلود سی ہنسی ہنستے ہوئے بولا "بڑے بھیا! رتنا کی وہ بات میں آج تک نہیں بھولا۔ جب ماں مری تھیں، یہ بہت چھوٹی تھیں۔ اس وقت انھوں نے میرے آنسو پونچھ کر کہا تھا۔ رمیش بھیا! روؤ نہیں، میری ماں تو ہے ہی۔ ہم دونوں اسی کو آدھا آدھا بانٹ لیں گے ۔۔۔ کیوں رتنا، تمہیں تو وہ بات یاد نہ ہوگی؟ اچھا میری ماں کی تو تمہیں یاد ہے نا؟"

یہ سنکر رتنا کا سر گویا شرم سے اور بھی جھک گیا وہ ذرا سا سر ہلا کر بھی یہ نہ جتا سکی کہ تائی جی کی سب باتیں مجھے خوب یاد ہیں۔ رمیش خاص طور پر رتنا کو سنا کر کہنے لگا۔ "اب وقت بالکل نہیں صرف تین دن باقی رہ گئے ہیں۔ جو کچھ کرنا ہے، وہ سب کر ڈالو جیسے بالکل بے آسرا کہتے ہیں۔ یہاں ہو کر بھی میں تم لوگوں کے دروازے پہنچا ہوں۔ تم لوگوں کے بغیر میں کوئی ذرا سا بھی انتظام نہ کر سکوں گا۔"

موسی چپ چاپ آکر رمیش کے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ جب دینی یا رتنا میں سے کسی نے بھی رمیش کی بات کا جواب نہ دیا تو وہ سامنے آگئیں اور رمیش کے منہ کی طرف دیکھ کر بولیں "کیوں بھیا! تم تارنی گھوشال ہی کے لڑکے ہو نہ؟"

رمیش نے آج سے پیشتر کبھی موسی کو نہ دیکھا تھا، کیوں کہ جب وہ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تھے تو رتنا کی ماں کی علالت کے دوران میں وہ اس گھر میں آئی تھیں۔ اور اس وقت سے اس گھر کے باہر نہیں نکلیں۔ رمیش حیران سے ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ موسی نے کہا "اور نہیں تو ایسا بیٹا اور کون ہوگا بھیا

باپ دلیا بیٹا۔ نہ کچھ کہنا، نہ کچھ پوچھنا! ایک بھلے آدمی کے گھر میں گھس کر اس طرح شور مچاتے تمہیں شرم نہیں آتی ؟"

رتیش حیران وششدر سے دیکھتے رہ گئے۔ وہیں یہ کہتے ہوئے وہاں سے کھسکے ——"اچھا تو میں اب چلتا ہوں"۔

رما نے کوٹھڑی کے اندر سے کہا "موسی! تم بھی کیا بک بک کر رہی ہو، تم اپنا کام کرو نہ جا کر!"

موسی نے سمجھا کہ وہ بھانجی کا چھپا ہوا اشارہ سمجھ گئی ہیں، اس لئے انہوں نے اپنے لب و لہجہ میں اور بھی زہر ملا کر کہا "دیکھو رما، تم نہ بولو، جو کام کرنا ہی ہے اس کے لئے میری آنکھوں میں تمہاری طرح شرم دلحاظ نہیں۔ بھلا رتیش کو اس طرح ڈرکر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنا تو کہہ جاتا کہ بھیا ہم نہ تو تمہارے نوکر چاکر ہیں اور نہ تمہاری زمینداری کی رعایا ہیں جو ہم تمہارے کام و صف سے گھر میں پانی بھرنے اور آٹا گوندھنے آئیں گے تاکہ مرا تو گاؤں بھر میں ٹھنڈا ہوا۔ یہ کہنے کا بوجھ مجھ پر چھوڑنے کی بجائے خود ہی اس کے منہ پہ کہہ جاتا تو مردانگی کا کام ہوتا"

رتیش اب بھی خاموش، پتھر کی مورتی کی طرح کھڑے رہے دراصل ان باتوں کا انہیں خواب میں بھی خیال نہ تھا۔ اندر سے رسوئی گھر کی کھڑکی جھن جھن کرتی رہی تھی۔ لیکن موسی نے بھی اس طرف توجہ نہ کی۔ موسی نے رتیش کے پریشان سے اور زرد پڑتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر پھر کہنا شروع کیا "خیر کچھ بھی ہو لیکن ہیں ایک برہمن کے لڑکے کی دربانی یا نوکری سے چلے عزتی نہیں کروانی چاہتی۔ بھیا، تم ذرا ہوش ٹھکانے رکھ کر کام کرو۔ یہاں سے فوراً چلے جاؤ۔ تم کوئی نادان بچے نہیں ہو جو بھلے آدمیوں کے گھر میں گھس کر سب کو تاؤ دکھاتے پھرتے ہو۔ تمہارے گھر ہماری تنا کبھی پاؤں دھونے بھی نہ جائے گی——!!"

رتیش گویا اچانک نیند ٹوٹنے پر جاگ پڑے۔ اچانک ان کے سینے سے ایک سرد آہ باہر نکلی اور اس کی آواز نے خود انہیں بھی حیران کر دیا۔ گھر کے اندر سے کواڑ کی آڑ سے رتنا نے سر اٹھا کر دیکھا۔ رتیش نے پہلے تو شاید کچھ ادھر ادھر کیا اور پھر رسوئی گھر کی طرف دیکھ کر کہا: "اگر کسی طرح۔ نہیں جا سکتیں تو پھر چارہ ہی کیا ہے؟ لیکن میں تو یہ سب باتیں جانتا ہی نہ تھا۔ رانی، نادانستہ میں مجھ سے جو بھول ہو گئی اس کے لئے مجھے معاف کرنا۔"

یہ کہہ کر رتیش آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔ کوٹھری کے اندر سے کسی طرح کی کوئی آواز تک نہ آئی۔ رتیش کو اس بات کا بھی پتا نہ چل سکا کہ جس سے معافی مانگی تھی۔ وہ آڑ میں کھڑی ان کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی دیبی پھر وہاں آ پہنچے۔ وہ وہاں سے بھاگے نہ تھے۔ بلکہ باہر چھپ کر صرف رتیش .... کے وہاں سے جانے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ موسی سے آنکھیں چار ہوتے ہی۔ ان کا چہرہ مسرت اور ہنسی سے بھر گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کہا: "واہ موسی! تم نے بھی خوب کھری کھری سنائیں! اس طرح کی باتیں ہمارے منہ سے تو کبھی نکل ہی نہ سکتی تھیں۔ رہا۔ یہ کیا کسی ڈرکر یا دربان کا کام تھا؟ میں تو باہر آڑ میں کھڑا کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ لونڈا سا شعر کے بادل کی طرح منہ بنا کر چلا گیا۔ بہت اچھا ہوا۔"

موسی نے جھنجھلاتے ہوئے سے لیکن فخریہ لہجے میں کہا: "ہاں یہ تو میں جانتی ہوں کہ بہت اچھا ہوا۔ لیکن اگر تم یہ سب باتیں کہنے کا بوجھ ہم دو عورتوں پر چھوڑ کر کھسک نہ جاتے اور خود ہی کہتے اور بھی اچھا ہوتا۔ اور اگر تم یہ سب باتیں نہیں کہہ سکتے تھے۔ تو یہیں کھڑے ہو کر کیوں نہیں سن گئے کہ ہم نے اسے کیا کہا؟ تمہارا اس طرح یہاں سے کھسک جانا مناسب نہ تھا۔"

دیبی کے چہرے پر مسکراہٹ موسی کی باتوں کے کڑوے پن میں مل کر ہوا ہو گئی۔

ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ اس الزام میں اپنی کیا صفائی پیش کروں! لیکن انہیں زیادہ دیر تک نہ سوچنا پڑا۔ اچانک رتنا اندر سے موسی کی باتوں کا جواب دے بیٹھی۔ اتنی دیر تک وہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے کہا "موسی! جب تم نے خود ہی سب باتیں کہہ دیں تو یہ سب سے اچھا ہوا اور کوئی خواہ کتنا ہی کیوں نہ کہتا، لیکن وہ تمہاری طرح زبان سے اتنا زیادہ زہر تو نہ اگل سکتا۔"

موسی اور دینی دونوں کو انتہائی حیرت ہوئی، موسی نے رسوئی گھر کی طرف مڑ کر پوچھا "کیا کہا تو نے؟"

رتنا نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ پوچھا کرتی کرتی تم سات بار اٹھیں۔ جاؤ۔ جا کر پوجا تو پوری کر لو۔ آج کیا رسوئی وغیرہ کچھ نہ ہوگی؟"

یہ کہہ کر رتنا خود ہی باہر نکل آئی۔ اور بغیر کسی سے کچھ کہے سنے برآمدہ پار کر کے دوسری طرف کی کھڑکی میں چلی گئی۔ دینی نے خشک منہ سے بہت آہستہ سے پوچھا "موسی! یہ بات کیا ہے؟"

موسی نے کہا "بھیا! میں کیا جانوں۔ آج رانی کا مزاج سمجھنا کیا ہماری ایسی نوکرانیوں اور مزدورنیوں کا کام ہے؟"

یہ کہتے کہتے غم و غصہ کے مارے موسی کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ وہ جا کر پھر پوجا کے آسن پر بیٹھ گئیں۔ اور دل ہی دل میں بھگوان کے نام کی مالا جپنے لگیں۔ دینی تھوڑی دیر تک تو ساکت رہے، پھر وہ بھی آہستہ آہستہ وہاں سے چلے گئے۔

(۲)

اس گاؤں —— کنواں پور کی زمین جائداد کی تاریخ بھی عجیب ہے! جسے یہاں بیان کر دینا ضروری ہے۔ تقریباً سو برس پیشتر ناگرجی خاندان کے ایک بزرگ بلرام ناگرجی اپنے ہم نام دوست بلرام گھوشال کو ساتھ لے کر بکرم پور سے یہاں آئے تھے۔ بلرام ناگرجی انتہائی محنتی اور معاملہ فہم تھے۔

انھوں نے پہلی شادی کر کے، سرکاری ملازمت کر کے اور ساتھ ہی ساتھ نہ جانے کیا کچھ کر کے یہاں جائداد حاصل کی تھی۔ گھوشال نے بھی اسی علاقے میں شادی کر لی —— لیکن ان میں آبائی قرض سے سبکدوش ہونے کے سوا اور کسی بات کی اہلیت نہ تھی۔ اس لئے وہ مرتے دم تک تنگ دستی ہی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ شادی ہی کے معاملے میں دونوں ہم ناموں میں کچھ نفاق سا پیدا ہو گیا تھا اور آخر وہ نفاق اتنا بڑھا، جیسے فساد کی صورت اختیار کر گیا کہ بیس برس تک ایک ہی گاؤں میں رہنے کے باوجود انھوں نے کبھی ایک دوسرے کا منہ تک نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ جس دن بلرام ناگرجی کا انتقال ہوا، اس دن بھی بلرام گھوشال نے ان کے گھر پاؤں نہیں رکھا۔ لیکن ناگرجی کے مرنے کے دوسرے روز ایک حیرت ناک بات معلوم ہوئی کہ وہ اپنی تمام جائداد دو مساوی حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ اپنے بیٹے کو اور دوسرا حصہ اپنے ہمنام دوست کے لڑکوں کو دے گئے ہیں۔ اسی وقت سے کنواں پور کی جائداد ناگرجی اور گھوشال کے گھرانوں کے قبضہ و اختیار میں چلی آ رہی ہے۔ یہ لوگ خود بھی اس بات پر فخر کرتے ہیں اور گاؤں کے لوگ بھی اس بات سے انکار نہیں کرتے۔ ہم جس وقت کا ذکر کر رہے ہیں، اس وقت گھوشال خاندان بھی دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ بہت دن

ہوئے اس خاندان کی چھوٹی شاخ کے مالک تارنی گھوشال مقدمے کے سلسلے میں ضلع کچہری میں گئے ہوئے تھے۔ وہاں عدالت میں ان کے پانچ سات چھوٹے بڑے مقدموں کی تاریخیں تھیں۔ لیکن ان سب مقدموں کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ نہ جانے کون سی سب سے بڑی عدالت کا حکم قبول کر کے چپ چاپ اس دنیا سے منہ موڑ گئے۔ کنواں پور گاؤں اور اس کے قرب و جوار میں کہرام مچ گیا۔ گھوشال خاندان کی بڑی شاخ کے مالک دینو گھوشال اپنے چچا کی موت سے خوش ہوئے۔ اور دل ہی دل میں اطمینان کی سانس لیکر گھر لوٹ آئے پھر اندر ہی اندر جتھہ بندی کر کے اس بات کی کوشش کرنے لگے کہ چچا کے شرادھ کے دن رکاوٹ ڈال جائے اور شرادھ اچھی طرح نہ ہو سکے۔ گزشتہ دس برس سے چچا بھتیجے نے ایک دوسرے کا منہ نہ دیکھا تھا۔ دس برس پیشتر تارنی گھوشال کی بیوی کے مر جانے سے ان کا گھر سونا ہو گیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے اپنے بیٹے رتیش کو اس کے ماموں کے گھر بھیج دیا تھا اور خود اپنے گھر میں ملازموں اور نوکرانیوں کے ساتھ اور باہر معاملے مقدموں میں مصروف رہ کر اپنے دن گزارتے تھے۔ رتیش کو اپنے باپ کے مرنے کی افسوسناک اطلاع کالج میں ملی اور وہ اپنے باپ کے مرنے کے آخری مراسم ادا کرنے کے لیے ایک مہینے کے بعد کل تیسرے پہر اپنے دیران گھر میں آ پہنچے۔

شرادھ میں صرف دو تین دن رہ گئے تھے۔ اتوار کو رتیش کے پتا کا شرادھ تھا۔ ایک ایک دو دو کر کے قریبی گاؤں کے بڑے بوڑھے آہستہ آہستہ آ رہے تھے لیکن خود کنواں پور کا کوئی آدمی نہیں آیا تھا۔ رتیش نے یہ بات سمجھ لی اور شاید یہ بھی سمجھ لیا کہ اس گاؤں کا کوئی آدمی آخری لمحہ تک نہ آئیگا۔ البتہ بھیرو اچاریہ اور دس گھر کے تمام افراد آکر کام کاج میں ہاتھ بٹا رہے تھے۔ اگرچہ رتیش کو یہ امید نہ تھی کہ خود ہمارے گاؤں کے براہمنوں کے چرنوں کی دھول ہمارے گھر

ہیں پڑے گی، تاہم وہ اپنے یہاں کا تمام کام بدستور بڑے آدمیوں ہی کی طرح کر رہے تھے۔ آج وہ بہت دیر سے اپنے گھر کے اندر ہی کام دھندوں میں لگے ہوئے تھے۔ جب وہ کسی کام سے باہر نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ بیرونی بیٹھک میں دو بوڑھے شریف آدمی بستر پر بیٹھے تمباکو پی رہے ہیں۔ وہ ان کے سامنے پہنچ کر ادب سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ انہیں عقب میں کچھ آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا ——— ایک بہت ہی بوڑھے اپنے ساتھ پانچ چھ لڑکے لڑکیوں کو لئے کھانستے ہوئے اندر چلے آ رہے ہیں۔ ان کے کندھے پر ایک میلا سا دوپٹہ ہے۔ ناک پر ایک چوڑی بینگن کی طرح ایک بڑا چشمہ ہے جو ڈورے سے پیچھے بندھا ہوا ہے۔ سر کے بال بالکل سفید ہیں مونچھیں بھی بالکل سفید۔ لیکن تمباکو کے دھوئیں سے تانبے کی طرح ہو رہی ہیں کچھ اللہ کے ڈھکوسلے لئے اسی سیاہ چشمے میں سے گھورتی ہوئی نگاہ رمیش کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے ایکدم رونے لگے۔ رمیش نہ پہچان سکے کہ یہ کون ہیں لیکن وہ کوئی بھی ہوں رمیش گھبرا کر انکی طرف بڑھے جیسے ہی رمیش نے ان کا ہاتھ پکڑا وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ اٹھے "تمہیں بھیا رمیش ہمیں تو خواب میں بھی یہ نہ دھیان تھا کہ تارنی مجھے اس طرح دھوکا دیکر چل دیں گے۔ لیکن میرا بھی ایسے چیٹرجی خاندان میں جنم نہیں ہوا۔ جو کسی کے خوف سے منہ سے جھوٹی بات نکال لے۔ میں یہاں آتے وقت تمہارے دینی گھوشال کے منہ پر کہہ آیا ہوں۔ کہ تمہارے رمیش جیسے شردھا کا انتظام کر رہے ہیں ایسا شرادھ کرنا تو کجا اس طرف کبھی کسی نے آنکھ سے دیکھا بھی نہ ہوگا۔"

قدرے رک کر انہوں نے پھر کہا "میرے بارے میں بہت سے لوگ تم سے طرح طرح کی باتیں کہیں گے۔ لیکن یہ یقین جانو کہ یہ دھرم داس جو دھرم ہی کا داس ہے اور کسی کا نہیں۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اپنی صداقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گووند گنگولی سے

ہاتھ سے حقہ چھین لیا اور اس کا ایک کش کھینچتے ہی بڑے زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔

دھرم داس نے کچھ زیادہ مبالغہ نہ کیا تھا۔ وہاں شرادھ کا جو انتظام ہو رہا تھا۔ ویسا اس طرف آج تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ کلکتے سے حلوائی آئے تھے اور انہوں نے صحن میں ایک طرف اپنی بھٹی بنا رکھی تھی۔ اسکے چاروں طرف محلے کے لڑکوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ کنگالوں کو کپڑے بانٹے جانے والے تھے۔ چنڈی منڈپ کے اس طرف برآمدے میں بجیر (؟) آ چار بہ تھانوں میں سے دھوتیاں پھاڑ پھاڑ کر اور تہ کر کے ان کے ڈھیر لگا رہے تھے۔ اُدھر بھی کئی آدمی جم کر بیٹھے تھے۔ اور اس فضول خرچی کا حساب لگا کر رمیش کو ان کی اس حماقت پہ دل ہی دل میں گالیاں دے رہے تھے۔ غریب نلاکت زدہ لوگ لوگ خبر پاکر دُور دُور سے چلے آ رہے تھے۔ تمام گھر طرح طرح کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ کہیں کچھ لوگ لڑ جھگڑ رہے تھے۔ تو کہیں جھوٹ موٹ شور ہی مچا رہے تھے۔ چاروں طرف دیکھنے پر جب دھرم داس کو خرچ کی اس زیادتی کا پتہ چلا تو ان کی کھانسی اور بھی بڑھ گئی۔

دھرم داس کی باتوں کے جواب میں رمیش شرما کر "نہیں نہیں" کے علاوہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔ لیکن دھرم داس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک کر دھرم داس اور بھی نہ جانے کتنی باتیں کہہ دیں۔ لیکن کھانسی کے زور کے باعث ان باتوں کا ایک لفظ بھی کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

گووند گنگولی سب سے پہلے آئے تھے۔ جو باتیں دھرم داس نے کہی تھی۔ وہ سب باتیں کہنے کا موقعہ سب سے پہلے گووند ہی کو ملا تھا۔ لیکن گووند کے منہ سے یہ باتیں نہ نکل سکیں۔ اس لئے وہ سوچنے لگے کہ میں نے ایسی اچھی باتیں کہنے

کا مزلعہ یونہی ضائع کیا ۔ اور یہ سوچ کر انہیں بے حد افسوس ہو رہا تھا ۔ لیکن اب یہ جو
دوسرا امر فیصلہ تھا سے انہوں نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔ انہوں نے دھرم داس کو
سناتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا " کل صبح ، سبھے نہ بھیا دھرم داس ! یہاں
آنے کے لئے میں گھر سے نکلا ہی تھا کہ لگے رینی مجھے پکارنے ۔۔۔۔۔ گرو ند چچا ! ذرا
سنا کر تو چلتے جاؤ ! پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں پھر دل
میں آیا کہ ذرا چل کر اس کے دل کی تھاہ تو لینی چاہیے ۔ بھیا رمیش ! تم جانتے ہو ۔ کہ
رینی نے کیا کہا ۔ اس نے کہا کہ چچا ! تم تو رمیش کی مدد کرنے کے لئے کمر سے باندھے ہو ۔
لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا اور سب لوگ یوں ہی کھائیں پئیں گے ؟
بھلا میں کیوں چھوڑنے لگا ؟ تم بڑے آدمی ہو تو ہوا کرو ۔ ہمارے رمیش بھی کسی
سے کم نہیں ہیں ۔ تمہارے گھر سے تو کسی کو مٹھی بھر چڑوے بھی ملنے کی امید نہیں
میں نے کہا ۔ موہنی بابو ایسی تو آنے جانے کا راستہ ہے جب غریب اور کنگال رخصت
ہونے لگیں تو ذرا گھر سے باہر کر دیکھنا ۔ رمیش ابھی لڑکے ہیں تو کیا ہوا ۔ کلیجا اس کو کہتے
ہیں ا میری اتنی عمر ہوئی ، لیکن آج تک ایسی تیاری آنکھ سے دیکھی نہ کان سے سنی
لیکن میں یہ بھی کہتا ہوں بھیا ! کہ ہم لوگوں کے بس میں ہے ہی کیا ! جن کا کام ہے
وہی اوپر سے سب کرا رہے ہیں ۔ " تارنی بھیا اگر شاپ بھرشٹ " دیال نہیں تھے
تو کیا تھے ؟ "

لیکن دھرم داس کی کھانسی کسی طرح رکتی ہی نہ تھی ۔ دو کھانستے ہی رہ گئے ۔
اور ان کے دیکھتے گنگولی مہاشے اتنی اچھی اچھی اور اتنی زیادہ باتیں اس ناواقف اور
معاملہ ناشناس زمیندار کے سامنے کہہ گئے ۔ یہ دیکھ کر دھرم داس ان سے بھی زیادہ
اچھی باتیں کہنے کی کوشش میں مضطرب ہو اٹھے ۔
گنگولی مہاشے پھر کہنے لگے " بھیا ! تم کوئی غیر تو ہو نہیں ۔ بالکل اپنے ہی

ٹھہرے۔ تمہاری ماں ہماری حقیقی پھپھیری (عموزاد) بہن کی ممیری (ماموں زاد) بہن تھی ——— لادھا نگر کے بیز جی کا گھر ——— تارنی بھیا یہ سب باتیں جانتے تھے۔ اسی لئے تو جب کوئی کام دھندا ہوتا تھا۔ معاملہ مقدمہ ہوتا تھا۔ گواہی ساکھی ہوتی تھی، تو بس ——— بلاؤ گوبند کو!"

اب دھرم داس نے جان لڑا کر اپنی کھانسی روکی اور چڑ کر کہا: "گوبندا! کیوں فضول بکے جا رہے ہو۔ کھونہہ کھونہہ، میں کوئی آج کا تو ہوں نہیں۔ میں کیا نہیں جانتا! اس سال مجھے گواہی دینے کی بات چلانے پر تم نے کہا کہ میرے پاؤں میں جوتا نہیں میں پھر کیسے چلوں گا۔ کھونہہ کھونہہ کھونہہ تارنی بھیا نے فوراً اڑھائی روپے لگا کر ایک جوڑی خرید کر دیا ——— اور پھر تم وہی جوتا پہن کر دینی کی طرف سے گواہی دے آئے۔ کھونہہ کھونہہ۔ کھونہہ!" گوبند کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے پوچھا: "میں نے گواہی دی ہے؟" دھرم داس نے بھی ترکی بہ ترکی کہا: "گواہی نہیں دی ہے؟"

"چل جھوٹا کہیں کا!"

"جھوٹا ہوگا تیرا باپ!"

گوبند نے اپنا ٹوٹا ہوا چھاتہ ہاتھ میں اٹھا لیا اور اچھل کر کہا: "اچھا تو آ سالے!"

دھرم داس نے اپنی بانس کی چھڑی اوپر اٹھا کر ہنکار کیا اور پھر خوب زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔ زمینش گھبرا کر دونوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے۔ دھرم داس اپنی لکڑی نیچے کر کے کھانستے ہوئے بیٹھ گئے اور بولے: "تم ہیں رشتے میں اس سالے کا بڑا بھائی ہوتا ہوں کہ نہیں! اسی لئے سالے کی عقل تو دیکھو ———"

گوبند گنگولی بھی اپنے ہاتھ کا چھاتہ نیچے رکھ کر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے:۔ "ہیں! یہ سالا میرا بڑا بھائی ہے!"

شہر کے حلوائی اپنی بھٹی کا دھیان چھوڑ کر یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ چاروں

طرف جو لوگ کام دھندے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ بھی یہ شور غل سن کر تماشا دیکھنے کے لئے آ پہنچے۔ لڑکے بچے کھیل چھوڑ کر لڑائی کا لطف اٹھانے لگے اور ان سب لوگوں کے سامنے رتیش حیرت اور شرم کے مارے حیران و ششدر ہو کر چپ چاپ کھڑے رہے۔ ان کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ یہ کیا ہو رہا ہے بدھوؤں ہی پڑھے۔ بھلا آدمی اور برہمن ہیں لیکن معمولی سی بات پر یہ لوگ نیچ آدمیوں کی طرح گالی گلوچ کر سکتے ہیں! برآمدے میں بیٹھے ہوئے جیتر داجا رہے کپڑوں کے ڈھیر لگا رہے تھے اور یہ سب باتیں دیکھ اور سن رہے تھے۔ اب وہ اٹھ کر وہاں آ پہنچے اور رتیش سے کہنے لگے "کوئی چار سو دھوتیاں تو ہو چکیں۔ کیا ابھی اور دھوتیوں کی ضرورت ہوگی؟"

لیکن رتیش کے منہ سے فوراً کوئی بات ہی نہ نکلی۔ رتیش کی یہ حالت دیکھ کر جیتر کو ہنسی آ گئی۔ انہوں نے بہت ہی نرم لہجے میں کہا "جی، گنگولی مہاشے! بابو تو بالکل حیران رہ گئے ہیں۔ بابو آپ ان باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ اس طرح کی باتیں تو یہاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ بڑے کام دھندے کے گھر میں نہ جانے کتنی لڑائیاں اور کتنے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مار پیٹ اور خون خرابہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور پھر سب مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اچھا آپ اٹھئے جیتر جی مہاشے، ذرا دیکھ لیجئے کہ میں اور دھوتیاں پھاڑوں یا نہ؟"

لیکن دھرم داس کے جواب دینے سے پہلے ہی گووند گنگولی بڑے جوش سے سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے "ہاں، یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اکثر ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاستروں میں لکھا ہے کہ جب تک دھوتیاں نہ ہوں، اس وقت تک بیاہ ہی نہیں ہوتا۔ اس سال کی بات کیا تمہیں یاد نہیں۔ بھیرو گرجی کی لڑکی رتنا کے بیاہ کا کام جس دن شروع

ہوا تھا۔ اس دن راگھو بھیا چارپہ اور ہیرن چیتھڑی میں سر پھٹول
تک ہو گئی تھی۔ لیکن بھیرو بھیا۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ چھوٹے بھیا کا
یہ کام اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ چھوٹے آدمیوں کو دھوتیاں بانٹنا اور
راکھ میں گھی ڈالنا دونوں برابر ہیں۔ اس کے بجائے تو اگر برہمنوں کو
ایک ایک جوڑا دھوتی اور ان کے بچوں کو ایک ایک دھوتی دی جاتی تو نام
ہو جاتا۔ میں تو کہتا ہوں کہ چھوٹے بھیا کو یہی کرنا چاہیئے۔ کیوں دھرم داس
بھیا، تمہاری کیا رائے ہے؟"

دھرم داس نے سر ہلاتے ہوئے کہا —— "رتیش بھیا، گووند نے
کوئی بُری بات نہیں کہی ہے۔ ان سالوں کو ہزار دیا جائے۔ پھر بھی کوئی نام
ہونے کی امید نہیں۔ ورنہ انہیں چھوٹے آدمی کیوں کہا گیا ہے۔ سمجھے نہ بھیا
رتیش!"

ابھی تک رتیش خاموش تھے۔ کپڑے تقسیم کرنے کی اس تنقید سے وہ گویا
بہت ہی متاثر ہوئے۔ لیکن وہ ان کے دلائل کی معقولیت یا غیر معقولیت سے متاثر نہ ہوئے
تھے۔ اس وقت تو ان کے دل میں سب سے زیادہ یہی بات کھٹک رہی تھی کہ یہ لوگ جنہیں
چھوٹے یا نیچ آدمی کہتے ہیں۔ اپنی لوگوں کی موجودگی آنکھوں کے سامنے یہ ایسا
ذلت آمیز کام کر بیٹھے۔ اور اس کے لئے ان لوگوں میں سے کسی کے دل میں ذرہ بھر
افسوس یا ندامت نہیں۔ جب رتیش نے دیکھا کہ بھیرو آچاریہ ان کے منہ کی طرف
دیکھ رہے ہیں تو انہوں نے کہا "آپ دو دو سو دھوتیاں تیار کر رکھیے"

گووند درمیان ہی میں بول اٹھے "ہاں" ان کے بغیر کام کیسے چلے گا۔ بھیرو
بھیا، چلو میں بھی چلتا ہوں۔ تم اکیلے کہاں تک کرو گے؟"

یہ کہہ کر کسی کی رائے کا انتظار کئے بغیر گووند کپڑوں کے ڈھیر کے پاس

جا پہنچے۔ رمیش اندر جانا ہی چاہتے تھے۔ کہ دھرم داس انہیں بلا کر ایک طرف لے گئے۔ اور آہستہ آہستہ ان کے کان میں بہت سی باتیں کہیں۔ جواب میں رمیش نے سر ہلا کر گویا اپنی رائے ظاہر کی اور اندر چلے گئے۔ گووند گنگولی نے کپڑوں کی تہ لگاتے ہوئے کنکھیوں سے یہ سب کچھ دیکھا۔

اتنے میں ایک دبلے پتلے بوڑھے برہمن جن کی مونچھیں مڑی ہوئی تھیں۔ یہ کہتے ہوئے آ پہنچے "بھیا کہاں ہیں؟ رمیش بھیا کہاں ہیں؟"

ان برہمن دیوتا کے ساتھ دو تین لڑکے لڑکیاں بھی تھیں۔ لڑکی سب سے بڑی تھی۔ اس کے بدن پر ایک بے حد میلی پرانی ڈورے کی دھوتی تھی۔ دونوں لڑکوں کی کمر میں صرف ایک ایک لنگوٹی تھی۔ اور اس کے سوا وہ بالکل ننگ دھڑنگ تھے۔ سب نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ گووند نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا "آؤ۔ دینو بھیا، بیٹھو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ کے قدموں کی خاک یہاں پڑی۔ بڑا کام اکیلا حیران ہوا جاتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ . . . ."

دھرم داس نے گووند کی طرف ذرا تیز نگاہ سے دیکھا۔ لیکن گووند نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر کہا "آپ لوگ تو بھیا اس طرف آئیں گے نہیں۔"

یہ کہہ کر گووند نے حقہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ دینو بھٹاچاریہ نے بیٹھ کر جلتے ہوئے حقے کے یونہی دو کش کھینچ کر کہا "ارے بھائی میں تو یہاں تھا ہی نہیں۔ تمہاری بہو کو لانے کے لئے اس کے باپ کے گھر گیا تھا۔ بھیا کہاں ہیں؟ سنا ہے کہ بہت بڑا انتظام ہو رہا ہے۔ راستے میں اس گاؤں کے بازار سے سنتا آ رہا ہوں۔ کہ سب کو کھلانے پلانے کے بعد چھوٹے بڑے سب کے ہاتھ میں سولہ سولہ پوریاں اور چار چار جوڑی سندیش[1] بھی دیئے جائیں گے۔"

---

[1] سندیش: بنگال کی ایک خاص مٹھائی (مترجم)

گووند نے لہجے کو قدرے دھیما کرتے کہا "اور اس کے علاوہ شاید ایک دھوتی
بھی لے گی سو دیکھو یہی رمیش بھیا ہیں۔ اسی لئے میں نے دینو بھیا سے کہا تھا کہ تم
ڈاکوؤں کے ـــــ چاندیوں کے ـــــ اٹھا کے نیز مدد سے سب جو دوڑتے تو
ایک طرح سے لٹایا جا رہا ہے۔ لیکن تو یہ بہت بڑی طرح سے پیچھے پڑا ہے۔
میرے آنے یہاں اس لئے بلانے کے لئے دو بار آدمی بھیجا تھا۔ لیکن میری بات چھوڑو
میرا تو رمیش کے ساتھ خون کا رشتہ ٹھہرا۔ لیکن یہ دینو بھیا بھی نے دھرم داس
بھیا ہونے۔ یہ لوگ کیا تمہیں یونہی چھوڑ سکتے ہیں؟ دینو بھیا تو راستے میں خبر سنکر
دوڑتے ہوئے یہاں آئے ہیں ـــــ ابے او رستی چرن! ذرا ٹھہرو تو دینو بھیا
رمیش ذرا ادھر آؤ۔ ایک بات کہنی ہے۔"

اس طرح گووند رمیش کو ایک طرف لے گئے۔ اور آہستہ سے ان سے پوچھنے لگے۔

"کیا اندر دھرم داس کی عورت آئی ہے؟

خبردار بھیا! ایسا کام نہ کرنا۔ یہ چالاک برہمن کتنا ہی کیوں نہ پھسلائے۔ لیکن
بھیا! تم دھرم داس کی عورت کے ہاتھ میں بھنڈار کی چابی نہ دینا۔ وہ گھی، آٹا تیل
نمک سب آدھا آدھا کھسکا دیگی۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے؟ ہم جاتے ہی
تمہاری بھابی کو بھیج دونگا۔ وہ آکر بھنڈار کا تمام بار سنبھال لے گی۔ اور تمہارا ایک
تنکا تک نقصان نہ ہونے پائیگا۔"

رمیش سر ہلا کر اور "جو حکم" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لیکن انکی حیرت کا ٹھکانہ نہ تھا۔
دھرم داس نے بہت ہی خفیہ طریق سے ان سے کہا تھا۔ کہ بھنڈار کا کام سمبھالنے
کے لئے ہم اپنی بیوی کو بھیج دینگے۔ لیکن گووند نے یہ بات کیسے بھانپ لی کہ دھرم داس
نے یہی بات کہی تھی؟

دو ننگ دھڑنگ لڑکے آئے اور دینو بھیا کے کندھے سے لٹک کر کہنے

لگے" بابا ہم سندیش کھائیں گے۔"

دینو نے ایک بار رتیش کی طرف اور پھر گووند کی طرف دیکھ کر کہا "ارے میں سندیش کہاں سے لاؤں؟"

لڑکوں نے حلوائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو وہاں تو رہے بھیا!"

اتنے میں اور لڑکے لڑکیاں روتی ہوئی وہاں آپہنچیں "بابا ہم بھی کھائیں گے" کہہ کر دھرم داس کو چاروں طرف سے گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔

رتیش گھبرا کر آگے بڑھ آئے اور کہنے لگے "اچھا، اچھا، اچھا رے جی، یہ سب لڑکے تیسرے پہر کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں، گھر سے کھا کر تو آئے نہیں ——— ارے کیا نام ہے تمہارا، وہ تھال تو ادھر لے آؤ۔"

حلوائی جیسے ہی سندیش کا تھال لے کر آیا۔ سب لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے انہوں نے کسی کو سندیش بانٹنے کا موقعہ بھی نہ دیا اور سب کو پریشان کر دیا۔ لڑکوں کو کھاتے دیکھ کر دینا ناتھ کی نگاہ بھی اور تیز ہو گئی۔ انہوں نے کہا "ارے گیتا کھا رہی ہے اور ذرا یہ بھی تو بتا سندیش بنے کیسے ہیں؟"

"بہت اچھے بنے ہیں بابا!" کہہ کر گیتا پھر سندیش کھانے لگی دینو نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے کہا "واہ، تم لوگوں کی بھی کوئی پسند ہے؟ میٹھا چاہیے بس! کیوں جی حلوائی ـ کڑاہی کیوں اتار دی؟ کیوں گووند بھیا، ابھی تو کچھ دن باقی ہے؟"

حلوائی نے کسی طرف دیکھے بغیر فوراً جواب دیا "جی ہاں، ہے کیوں نہیں ابھی تو بہت وقت ہے، اب بھی سندھیا پوجا . . . ."

دینو نے کہا "تو پھر ایک گووند بھیا کبھی دو سو ذرا وہ بھی چکھ کر دیکھیں کہ تم لوگ کلکتہ کے کیسے کاریگر ہو۔ نہیں نہیں۔ مجھے کیوں دے رہے ہو؟

اچھا تو پھر آدھا دو۔ آدھے سے زیادہ نہ دینا۔ ارے او شتشی چرن ذرا پانی تو لانا ہاتھ دھولوں۔"

اتنے میں رمیش نے پکار کر کہا: "شتشی چرن اندر سے تین چار رکابیاں بھی لیتے آنا۔"

مالک کا حکم ہوتے ہی اندر سے تین چار رکابیاں اور پان کے گلاس آگئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس بڑے تھال کی تقریباً نصف مٹھائی ان منیٹوں پورے اور بھیریا کے مارے ہوئے برہمنوں نے چل پان ہی میں ختم کر ڈالی۔

دینا ناتھ نے صاف سے لے کر کہا: "ہاں! یہ لوگ ہیں سکلھے کے کاریگر! کیوں دھرما بھیا!"

دھرم داس بھیا کے تھالے کی رکابی ابھی خالی نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کی آواز "سندیش" کے تالے کر زور کر ان کے منہ سے باہر نہ نکل سکی تاہم لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ اس بارے میں انہیں اختلاف نہیں۔

"ہاں! یہ ہے استادانہ ہاتھ!" کہہ کر جب گووند سب سے آخر میں ہاتھ دھونے لگے تو حلوائی نے نرمی سے کہا: "پنڈت جی مہاراج! جب آپ نے تکلیف ہی کی ہے تو ذرا یہ بوندی کا لڈو بھی چکھ لیجئے تو ذرا اس کی بھی پرکھ ہو جائے۔"

گووند نے کہا: "بوندی کا لڈو! کہاں ہے بھیا۔ ذرا لاؤ تو، دیکھ ہی لیں۔"

لڈو بھی آئے۔ اتنے سندیش ختم کرنے کے بعد بھی اس نئی چیز کا صحیح استعمال ہوتے دیکھ کر رمیش دیکھتے ہی رہ گئے۔ دینا ناتھ نے اپنی لڑکی کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا: "ارے منیا! لے تو بیٹی یہ بوندی کے دو لڈو!"

منیا نے کہا: "اب مجھ سے تو نہیں کھائے جائیں گے بابو جی!"

دینا ناتھ نے کہا: "ارے اکیلا کیوں نہیں جائے گا، کھایا جائے گا۔ ذرا

ایک گھونٹ پانی پی کر گلا تر کر لے، منہ آگیا ہوگا۔ اور اگر نہ کھایا جائے تو آنچل میں
گرہ دے کر باندھ لے۔ کل صبح کھا لینا۔ ہاں بھیا۔ خوب کھلایا۔ سب چیزیں گویا امرتا
ہیں امرت! بہت اچھی بنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ ہی طرح کی مٹھائی ہوائی ہے
بھیا؟"

رمیش کو جواب نہیں دینا پڑا۔ حلوائی ہی نے اشتیاق آمیز لہجے میں جواب دیا۔
"جی نہیں، رسگلے، کھیر موہن ..... "

دینا ناتھ نے متحیر رمیش کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا "کھیر موہن بھی ہے؟ کہاں
ہے بھیا؟ وہ تو تم نے نکالا ہی نہیں! کھیر موہن کھایا تھا میں نے رادھا نگر کے ایس
بابو کے گھر۔ آج تک جیسے منہ میں اس کا ذائقہ موجود ہے بھیا۔ میں بھول گیا تو نہیں
یقین ہوتا بھیا۔ لیکن کھیر موہن مجھے بے حد پسند ہے۔"

رمیش نے ہنس کر ذرا سر ہلا دیا۔ انہیں یقین کرنا زیادہ دشوار معلوم نہ ہوا۔
راکھال کسی کام سے باہر جا رہا تھا۔ رمیش نے اسے بلا کر کہا "راکھال، اور شاید
آچاریہ جی ہیں۔ ذرا جا کر ان سے کہو تو کچھ کھیر موہن لیتے آئیں۔" شام ہو گئی تھی لیکن
بھوجی برہمن کھیر موہن کی امید میں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد راکھال نے نہیں آ کر بولا "بھیا۔
ایسا چھینا وہ کوئی تالا نہیں کھلے گا۔"

رمیش دل ہی دل میں کچھ چڑ سے، انہوں نے کہا "جاؤ، جا کر بھوکے میں منگوا دیا
ہوں۔"

گووند گنگولی نے رمیش کی ناراضگی دیکھ کر آنکھیں نچاتے ہوئے کہا "دیکھو بھیا،
دیکھی بھیرو کی عقل! معلوم ہوتا ہے ماں سے بھی زیادہ موسی کو درد ہے!! اسی
لئے تو میں کہتا ہوں ....."

لیکن ان کی بات سنے بغیر ہی راکھال ہی نے کہا "آچاریہ جی کہا کرتے ہیں وہ

گھر سے مالکن نے آکر بھنڈار بند کر دیا ہے "
دھرم داس اور گوپال دونوں ہی چونک پڑے اور بولے ۔
"کون ؟ مالکن کون ؟"
رتنیش نے حیرت سے پوچھا "کیا تائی جی آئی ہیں ؟"
دھرم داس نے کہا " جی ہاں انہوں نے آتے ہی چھوٹے اور بڑے دونوں بھنڈاروں میں تالا لگا دیا ہے " حیرت اور مسرت کے مارے رتنیش کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور وہ اٹھ کر جلدی سے اندر چلے گئے ۔

---

(۳)

"تائی جی !"
آواز سنتے ہی وہ شولیشوری بھنڈار سے باہر نکل آئیں ۔ اگر دیوی کی صورت کا اندازہ کیا جائے تو ان کی عمر پچاس برس سے کم نہ ہونی چاہیئے ۔ لیکن یوں دیکھنے پر وہ کسی طرح چالیس برس سے زیادہ کی معلوم نہ ہوتی تھیں ۔ رتنیش ٹکٹکی لگا کر ان کی طرف دیکھتے رہے ۔ اب بھی ان کا رنگ کچے سونے کا سا رنگ تھا ۔ کسی وقت ان کے جس حسن کی بے حد شہرت تھی ان کا وہ بے مثال حسن آج بھی ان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اور صحت مند جسم کو چھوڑ کر جا نہیں سکا تھا ۔ ان کے سر کے بال کٹے ہوئے اور چھوٹے چھوٹے تھے ۔ جن کی کچھ لٹیں بل کھا کر پیشانی پر آ پڑی تھیں ناک ، رخسار ، ہونٹ ، پیشانی سب اعضا گویا کسی بہت بڑے سنگ تراش کی انتہائی کوشش اور کمال فن کا نتیجہ تھے ——— اور سب سے بڑھ کر وہ آنکھیں تھیں ۔ تھوڑی دیر ان کی طرف دیکھتے رہنے سے گویا تمام دل محبت سے لبریز

ہو جاتا ہے۔

یہ تائی جی کسی وقت رتیش اور خصوصاً اس کی آنجہانی ماں کو بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ بیاہ ہو جانے کے بعد جب کچھ وقت تک ان دونوں میں سے کسی کے بچے نہیں ہوئے اور ساس اور نند کی کوششوں سے اکتا کر، تنگ آ کر یہ دیورانی جیٹھانی چھپ کر ایک ساتھ بیٹھ کر روتیں تو یہ رشتۂ محبت پہلے میں استوار ہوا تھا۔ اس کے بعد افراد خاندان کی علیحدگی، معاملے مقدمے اور نہ جانے کتنی لڑائیاں اور جھگڑے ان دونوں کو ستانے پر آئے مگر گزر گئے۔ لڑائی جھگڑوں کے باعث وہ رشتۂ محبت قدرے کمزور ضرور ہو گیا لیکن پھر بھی ایک دم ٹوٹ نہ سکا۔

بہت دنوں کے بعد جب آج اسی دیورانی کے کھنڈر میں وہ گئیں تو اس کے ہاتھ کے سجائے ہوئے بہت پرانے برتن وغیرہ دیکھ کر تائی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رتیش کے پکارنے پر جب وہ اپنی آنکھیں پونچھ کر باہر نکلیں تو ان سرخ اور نم آلود آنکھوں کی طرف دیکھ کر رتیش کچھ دیر کے لئے حیران سے رہ گئے۔ تائی جی بھی یہ دیکھ گئیں۔ اور اسی لئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ رتیش کی طرف دیکھتے ہی ان کا دل رو اٹھا۔ لیکن انہوں نے اسے اندر ہی اندر دبا دیا۔ اور قدرے ہنستے ہوئے کہا۔ "رتیش بیٹے پہچان لیا؟"

جواب دیتے ہوئے رتیش کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ماں کے مرنے کے بعد جب تک رتیش اپنے ماموں کے گھر نہیں گئے تھے۔ اس وقت تک انہی تائی جی نے انہیں کلیجے سے لگا کر رکھا تھا اور وہ کسی طرح انہیں الگ ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ آج انہیں وہ باتیں بھی یاد آئیں اور ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ ابھی کل ہی جب میں تائی جی کے گھر گیا تھا۔ تو انہوں نے کہلا دیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں —— اور ملاقات تک کرنا پسند نہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد جب رتیش کے سامنے اور اس کی

غیبت میں بھی اس کی موسی نے ان کی انتہائی ہتک کی تھی تو انہوں نے یقینی طور پر سمجھ لیا تھا کہ اب اس گاؤں میں میرا کوئی نہیں۔

تھوڑی دیر تک رتیش کے چہرے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وشنو لیشوری نے کہا۔

"نہیں بیٹا، ایسے وقت میں دل مضبوط کرنا ہوتا ہے۔"

لیکن ان کی آواز میں جیسے نرمی اور مٹھاس کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔ رتیش نے اپنے آپ کو سنبھال لیا انہوں نے سمجھ لیا کہ جہاں روٹھنے کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہاں روٹھنے یا فخر و مباہات ظاہر کرنے کے مانند غلطی دنیا میں نہیں۔ انہوں نے کہا۔

"ہاں تائی جی، میں نے اپنا دل بڑا مضبوط اور سخت کر لیا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا وہ میں خود ہی کر لیتا۔ پھر تم کیسے چلی آئیں؟"

تائی جی ہنس پڑیں۔ انہوں نے کہا "رتیش تم تو مجھے بلا کر یہاں لائے نہیں جو میں تمہیں اس بات کی کیفیت دوں۔ اچھا سنو ———— جب تک سب کام کاج نہیں ہو جائے گا۔ میں کھانے پینے کی کوئی چیز بھنڈار سے نکلنے نہیں دوں گی۔ جب میں جانے لگوں گی تو بھنڈار کی چابی کنجی تمہارے ہاتھ میں دیتی جاؤں گی اور پھر کل آکر تمہیں سے لے لوں گی۔ دیکھو، چابی اور کسی کے ہاتھ میں نہ دینا۔ ہاں یہ تو بتاؤ۔ اس دن بڑے بھیا سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟"

یہ سوال سن کر رتیش بڑی کشمکش میں پھنس گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ تائی جی اپنے بیٹے کا برتاؤ جانتی ہیں یا نہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا "بڑے بھیا اس وقت تو گھر پر نہیں تھے۔"

سوال کرتے ہی تائی جی کے چہرے پر تردد کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ رتیش کو صاف دکھائی دیا کہ ان کے اس جواب سے تائی کا تردد دور ہو گیا۔ اور ان کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے، محبت

سے شکایت آمیز لہجے میں کہا: "واہ رے میری تقدیر! ارے اگر ایک بار ملاقات نہیں ہوئی تو دوبارہ نہیں جانا چاہئیے؟ میں جانتی ہوں کہ وہ تم لوگوں سے خوش نہیں ہے۔ لیکن تمہیں تو اپنا کام کرنا ہی چاہیئے۔ جاؤ۔ ایک بار پھر جا کر اس سے اچھی طرح کہو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس کے سامنے جھکنے میں تمہاری ہیٹی نہیں ہے۔ اور اس کے علاوہ بیٹا، یہ آدمی کے لئے کیا بڑا وقت ہے کہ اس میں سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر ان سے جھگڑا مٹا لینے میں شرم کی کوئی بات نہیں۔ میرے راجہ بیٹا! ایک بار جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ گھر پر ہوگا۔"

رمیش خاموش رہے۔ تائی جی کے اتنا زیادہ اصرار کرنے کا مقصد بھی وہ صاف صاف نہ سمجھ سکے اور ان کے دل کا شک بھی دور نہ ہوا۔ وشنو کیشوری نے کچھ اور آگے بڑھ کر نرم لہجے میں کہا: "باہر جو لوگ بیٹھے ہیں، انہیں میں تم سے بہت زیادہ جانتی ہوں۔ تم ان لوگوں کی باتیں نہ سننا۔ آؤ چلو میرے ساتھ اپنے بڑے بھیا کے پاس چلو۔"

رمیش نے سر ہلا کر کہا: "نہیں تائی جی، یہ بات نہ ہو گی۔ اور باہر جو لوگ بیٹھے ہیں۔ وہ چاہے جیسے بھی ہوں، لیکن اس وقت میرے وہی سب سے زیادہ اپنے ہیں۔" رمیش ابھی اور بھی نہ جانے کیا کیا کہنا چاہتے تھے۔ لیکن تائی جی کے چہرے کی طرف دیکھ کر انہیں بے حد حیرت ہوئی۔ اور وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ تائی جی کا چہرہ چاروں طرف پھیلی ہوئی شام کی تاریکی سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد تائی جی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: "اچھا یونہی سہی۔ جب تم کسی طرح اس کے پاس جا ہی نہیں سکتے تو پھر اس بارے میں کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ لیکن پھر بھی بیٹا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرنا۔ تمہارا کوئی کام رکا نہیں رہیگا۔ میں کل صبح جلد ہی آ جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر وشو لیشوری نے اپنی نوکرانی کو بلایا۔ اور اس کے ہمراہ کھڑکی والے راستے سے چلی گئیں۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اس دوران میں رمیش سے رینی کی ملاقات ہو چکی ہے اور کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ وہ جس راستے سے گئی تھیں۔ رمیش کچھ دیر تک خاموش کھڑے اس راستے کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ بہت اداس ہو کر باہر نکلے۔ تو گووند نے گھبرا کر پوچھا "کیوں بھیا۔ بھابی ماں جی آئی تھیں نا؟"

رمیش نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

گووند نے کہا "میں نے سنا ہے کہ وہ بھنڈار بند کر کے چابی اپنے ساتھ لیتی گئی ہیں"

رمیش نے یونہی سر ہلا کر اس کی بات کا جواب دے دیا کیونکہ چلتے وقت نہ جانے کیا سوچ کر تائی جی بھنڈار کی چابی اپنے ساتھ ہی لیتی گئی تھیں۔ گووند نے کہا "دیکھا نہ بھیا دھرم داس! میں نے جو کہا تھا وہی ہوا نا! کیوں بھیا رمیش مطلب سمجھ گئے نہ؟"

رمیش دل ہی دل میں بے حد نادم ہوئے۔ لیکن اپنی مجبوری کے خیال سے برداشت کر کے خاموش رہ گئے۔ دینو بھٹا چاریہ ابھی تک نہیں گئے تھے۔ ان میں ذرا سمجھ نہ تھی جس کی مہربانی سے وہ اپنے لڑکے لڑکیوں سمیت پیٹ بھر کر کھا سکے تھے۔ اسے دو چار دلی اشیرباد دے۔ اور سب کے سامنے بلند آواز سے ان کی سات پشتوں کی تعریف کئے بغیر وہ گھر نہیں جا سکتے تھے۔ انہوں نے انتہائی نرمی سے کہا۔ "بھیا اس کا مطلب سمجھنا کیا مشکل ہے۔ اور وہ جو تالا بند کر کے چابی اپنے ساتھ لیتی گئی ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے۔ کہ بھنڈار اور کسی کے ہاتھ میں نہ جائے۔ وہ سب کچھ تو جانتی ہیں۔"

گووند چڑ گئے تھے۔ بیوقوف دینو کی اس بات سے جل بھن کر انہوں نے

جھڑکتے ہوئے کہا: "جب تم کوئی بات سمجھتے بوجھتے ہی نہیں تو پھر درمیان میں بول کیوں پڑتے ہو؟ تم ان سب باتوں کا کیا سمجھ کر مطلب لگانے بیٹھ گئے؟"

جھڑکی سن کر دینو کی عقل بالکل غائب ہو گئی۔ انہوں نے بھی گرم ہو کر جواب دیا: "ارے اس میں سمجھنے بوجھنے کی کون سی بات ہے! سُنتے نہیں کہ مالکن خود آ کر صندوق بند کر کے چابی اپنے ساتھ لیتی گئی ہیں؟ اس میں اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟"

گووند نے آنکھ گھما کر کہا: "ارے بھیا جاؤ، تم اپنے گھر جاؤ نا! جس کام کے لئے دوڑے آئے تھے وہ تو ہو گیا۔ گھر بھر نے مل کر خوب کھایا اور پلے بھی باندھ کے لے چلے۔ اب کیوں ٹھہرے ہو؟ اب پرسوں کھیر پوری کھانا۔ اب اور کچھ نہیں۔ اس وقت جاؤ۔ ہمیں ابھی بہت سے کام ہیں۔" دینو شرماتے گئے ـــ اور رتیش اتنے ہی متاثر اور سنجیدہ ہوئے۔

گووند ابھی اور نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے۔ لیکن اچانک رتیش کی پُرسکون سنگین بھرائی ہوئی آواز سے رک گئے ـــ "گنگولی جی! آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ آپ اس طرح خواہ مخواہ کسی کی تحقیر و تذلیل کیوں کرتے ہیں؟"

گووند پہلے تو یہ جھڑکی سن کر حیران ہوئے۔ لیکن فوراً انہوں نے خشک ہنسی ہنس کر کہا: "بھیا۔ میں نے کس کی بے عزتی کی؟ آپ انہی سے پوچھیں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ ٹھیک ہے یا نہیں! یہ اگر ڈال ڈال چلتے ہیں تو میں پات پات چلتا ہوں۔ دیکھو نہ بھیا دھرم داس، اس دینو برہمن کی حماقت! اچھا۔"

یہ تو دھرم داس ہی جانیں کہ انہوں نے کیا دیکھا، لیکن رتیش اس آدمی کی بے شرمی اور ڈھٹائی دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ اس وقت دینو نے رتیش کی طرف دیکھ کر خود ہی کہا: "نہیں بھیا، گووند جی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ میں بہت غریب ہوں۔ ان سب لوگوں کی طرح میرے پاس زمین

یا کھیت کچھ بھی نہیں ۔ کسی طرح مانگ مانگ کر اپنے دن پورے کر رہا ہوں ۔ بھگوان نے مجھے اتنی توفیق تو دی نہیں کہ اپنے بچوں کو کوئی اچھی چیز کھلا سکوں ۔ اس لئے جب بڑے آدمیوں کے گھر کوئی کام کاج ہوتا ہے ۔ تو یہ کھا پی جاتے ہیں ۔ بھیا! آپ اس بات کا کچھ خیال نہ کریں ۔ جب نانی بھیا زندہ تھے تو ہم لوگوں کو کھلانا پلانا انہیں بہت پسند تھا اس لئے بھیا میں آپ سے یقینی طور پر کہتا ہوں ۔ کہ میں جو پیٹ بھر کے کھلایا ہے ۔ اسے اوپر سے دیکھ کر وہ خوش ہی ہوئے ہیں ۔"

یہ کہتے کہتے وتیز کی منڈیں اور خشک آنکھوں میں پانی بھر آیا اور سب کے دیکھتے دیکھتے ٹپ ٹپ آنسوؤں کی دو چار بوندیں بھی گر پڑیں ۔ رتیش نے منہ پھیر لیا ۔ وتیز نے اپنے میلے اور سینکڑوں جگہ سے پھٹے ہوئے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا بھیا! صرف میں ہی نہیں ، یہاں میرے ایسے جتنے غریب ہیں ۔ ان میں سے کوئی بھی کبھی نانی بھیا کے آگے ہاتھ پھیلا کر خالی نہیں لوٹا ۔ بھلا یہ سب باتیں کون جانے گا وہ دائیں ہاتھ سے جو دان کرتے تھے ۔ اس کا پتہ ان کے بائیں ہاتھ کو بھی نہ ہوتا تھا لیکن اب میں آپ لوگوں کو زیادہ تنگ نہ کروں گا ۔ تو بیٹی منیا ! اٹھ بیٹا ہری دھن ! چلو گھر چلیں ۔ اب کل صبح آئیں گے بھیا رتیش ! اب میں اور کیا کہوں یہی کہتا ہوں کہ اپنے پتا کی طرح بنو اور جگ جگ جیو ۔"

رتیش نے اس کے ساتھ سامنے تک آ کر گلوگیر آواز میں کہا " بھیا چار یہ جی دو تین دن تک مجھ پر نگاہِ کرم ہی رکھئے گا اور مجھے کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس گھر میں ہری دھن کی ماں کے قدموں کی خاک پڑے تو میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا ۔"

بھٹا چاریہ نے مضطرب ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے رتیش کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور روتے روتے کہا " بیٹا رتیش ۔ میں بہت ہی غریب اور دکھیا ہوں

تم جو مجھے اس طرح کی باتیں کہتے ہو تو میں شرم کے مارے مرا جاتا ہوں۔"

اپنے لڑکے اور لڑکی کو ساتھ لے کر بڑھا بہن آہستہ آہستہ چلا گیا۔ رمیش بھی لوٹ آئے۔ گنگولی جی سے انہوں نے جو سخت بات کہی تھی۔ اسے سوچ کر وہ کچھ کہنے ہی والے تھے۔ کہ انہیں روک کر گووند نے کہا۔ "بھیا رمیش، یہ تو ہمارا اپنا ہی کام ہے۔ اگر تم نہ بھی بلاتے جب بھی ہم لوگوں کو خود ہی یہاں آکر سب کام کرنے پڑتے۔ اسی لئے تو میں آیا ہوں۔ دھرم داس اور ہیں۔ دونوں بھائی تمہارے بلانے کی راہ ہی نہیں دیکھتے۔"

دھرم داس ابھی ابھی تمباکو پی کر کھانس رہے تھے۔ وہ اپنی لاٹھی کے سہارے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور کھانسی کے زور میں آنکھیں اور منہ سرخ کر کے ہاتھ ہلا کر بولے۔ "بھیا رمیش، سنو۔ میں دینی گھوشال نہیں ہوں۔ ہم لوگوں کی پیدائش کا ٹھیک ٹھکانا ہے۔"

دھرم داس کی اس اخلاق سے گری ہوئی بات سے رمیش چونک پڑے لیکن اب انہوں نے غصہ نہیں کیا۔ اس تھوڑی سی عمر ہی میں انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ تعلیم کی کمی اور تجربہ کے نقصان کے باعث بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کتنی بڑی گندی بات کہہ جاتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ وہ گندی ہے۔

"تائی جی کے محبت آمیز اصرار اور پر سوز لہجہ کو یاد کر کے رمیش دل ہی دل میں درد سا محسوس کر رہے تھے۔ سب کے چلے جانے پر وہ بھیا کے پاس جانے کے لئے تیار ہو لئے۔ جب وہ دینی کے منڈپ کے باہر جا کر پہنچے۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ اندر گویا ایک طرح کی لڑائی ہو رہی تھی۔ گووند گنگولی کی چیخ پکار سب سے زیادہ تھی۔ باہر ہی سے ان کے کانوں میں آواز پہنچی ——— گووند بلند آواز سے کہہ رہے تھے: "اگر چاروں میں یہ جڑ سے تباہ نہ ہو جائے تو تم لوگ

میرا نام بدل دینا۔ دینی بابو یہ سب لڑائی جیسی تیاری تم نے سُنی ہے نہ؟ میں جانتا ہوں کہ تائی گھوشال ایک پیسہ بھی چھوڑ کر نہیں مرے ہیں۔ تو پھر یہ لمبی چوڑی تیاری کیوں؟ ارے بھائی ہاتھ میں پیسہ ہو تو کرو۔ اگر نہیں ہے تو جائداد رہن رکھ کر کبھی کسی نے اپنے باپ کا شرادھ کیا ہے؟ دینی مادھو بابو میں آپ سے پورے یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس لونڈے نے نندی کی کوٹھی سے کم از کم تین ہزار روپے اُدھار لئے ہیں۔"

دینی نے پر اشتیاق بجے میں کہا "جب لگو نارجیا۔ اس کا پتہ پتہ لگا لینا چاہئے۔"

گرو چرن نے آواز نرم کر کے کہا "بھیا۔ ذرا صبر تو کرو۔ ایک دفعہ مجھے اچھی طرح وہاں گھس تو جانے دو۔ اس کے بعد ——— ارے یہ باہر کون کھڑا ہے؟ کون؟ رمیش ——— ارے بھیا! ہم لوگوں کے ہوتے ہوئے آپ اتنی رات کو باہر کیوں نکلے ہو؟"

لیکن رمیش اس کی بات کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھ آئے اور بولے "بڑے بھیا میں آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔"

دینی بابو سٹ پٹا گئے۔ اور کچھ جواب نہ دے سکے لیکن گرو چرن نے فوراً ہی کہا۔ آپ آئیں تھے کیوں نہیں بھیا! سو جانا نہیں گے۔ یہ تو آپ ہی کا گھر ہے اور بڑے بھائی تو باپ کے برابر ہیں۔ اسی لئے تو ہم دینی بابو سے کہنے آئے ہیں۔ کہ تائی بھیا کے ساتھ جو جھگڑا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گیا اب جھگڑا کیوں؟ آپ دونوں بھائی ایک ہو جائیں۔ اور ہم لوگوں کی آنکھیں یہ دیکھ کر ٹھنڈی ہوں۔ کیوں جائداد ماموں کیا کہتے ہو؟ ——— لیکن بھیا آپ کھڑے کیوں ہیں؟ ——— ارے کون ہے! ——— ذرا کمبل کا ایک آدھ آسن تو بچھا دو ——— نہیں دینی بابو آپ بڑے بھائی ہیں آپ ہی سب کچھ ہیں۔ آپ کے اس طرح الگ رہنے سے

کام نہ چلے گا اور پھر جب بڑی مالکن خود چل کر وہاں پہنچ گئی ہیں تو . . ."

دینی چونک پڑے انہوں نے پوچھا "کیا ماں گئی تھیں؟"

دینی کو چونکتے دیکھ کر گووند دل ہی دل میں خوش ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنے جذبات کو چھپا کر شریف آدمیوں کی طرح اس خبر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "خالی جانا ہی کیا، بھنڈارا ونڈارا، کام دھندا جو کچھ ہے سب وہی تو کر رہی ہیں اور پھر اگر وہ نہ کریں تو کرے کون؟"

سب لوگ خاموش تھے۔ گووند نے ایک لمبی سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہاں گاؤں بھر میں کیا بڑی مالکن کی طرح کوئی اور دادی ہے؟ یا کبھی ہو گا؟ نہیں دینی بابو، منہ پر کہنا خوشامد سمجھا جائیگا۔ لیکن لوگ چاہے کچھ کہیں گاؤں میں اگر کوئی لکشمی ہیں تو وہ تمہاری ماں ہیں۔ ایسی ماں کیا ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے؟"

یہ کہہ کر اور پھر ایک لمبی سانس چھوڑ کر وہ خاموش ہو گئے۔ دینی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "اچھا!"

گووند نے انہیں فوراً ہی پکڑ لیا اور کہا "دینی بابو۔ خالی "اچھا" کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو وہاں جانا اور سب کام کرنا پڑے گا۔ سب بوجھ آپ ہی پر ہے۔ ہاں اس وقت آپ سب لوگ تو یہاں موجود ہی ہیں۔ دعوت کن کن لوگوں کو دی جائے گی۔ اس کے بعد فہرست کیوں نہ تیار کر لی جائے؟ کیوں رمیش بابو؟ ہالدار ماموں ٹھیک ہے نا؟ دھرم داس بھیا آپ کیوں خاموش ہیں؟ آپ تو سب جانتے ہی ہیں۔ کس کس کو بلانا چاہیئے۔ اور کسے نہیں؟" رمیش نے کھڑے ہو کر نرم لہجے میں کہا "بڑے بھیا اگر آپ کے قدموں کی خاک میرے گھر . . ."

دینی نے متانت سے کہا "جب ماں وہاں گئی ہیں تو میرا جانا نہ جانا کیوں گووند چچا؟"

گووند کے کچھ کہنے سے پہلے ہی رمیش نے کہا "بڑے بھیا، میں آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتا۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ذرا ایک بار دکھوشن آئیے گا۔"

دینی خاموش رہے۔ گووند کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ اتنے میں رمیش چلے گئے۔

گووند نے پہلے ذرا باہر جا کر ادھر جھانک کر دیکھا، پھر آہستہ سے کہا "دینی بابو! آپ نے گفتگو کا اندازہ دیکھا؟" دینی بے دلی سے کچھ سوچ رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

راستے میں آتے وقت گووند کی باتوں کو یاد کر کے رمیش کا دل نفرت سے لبریز ہو گیا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ پھر لوٹے اور دینی کے گھر جا پہنچے۔ اس وقت جنڈی منڈپ میں خوب زور سے بحث ہو رہی تھی اور شور و ہنگامہ برپا تھا۔ لیکن اسے سننے کی بھی انہیں خواہش نہ تھی۔ انہوں نے سیدھے اندر پہنچ کر پکارا — "تائی جی!"

تائی جی اس وقت اپنی کوٹھڑی کے سامنے والے برآمدے میں اندھیرے میں خاموش بیٹھی تھیں۔ اتنی رات کو رمیش کی آواز سن کر انہیں بے حد حیرت ہوئی۔ انہوں نے کہا "رمیش؟ کیوں بھیا؟" رمیش پاس جا پہنچا۔ تائی جی نے گھبرا کر کہا۔ "ذرا ٹھہرو بیٹا۔ میں کسی سے چراغ لانے کے لئے کہہ دوں۔"

رمیش نے کہا "تائی جی، چراغ لانے کی ضرورت نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔" یہ کہہ کر رمیش اندھیرے ہی میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ تائی جی نے پوچھا "اتنی رات کو کیسے آئے بیٹا؟"

رمیش نے نرم لہجے میں کہا "ابھی تک لڑکوں کو دعوت نامے نہیں بھیجے گئے۔ اسی لئے میں آپ سے پوچھنے چلا آیا ہوں۔"

تائی جی نے کہا : "بیٹیا، جب تو تم نے مجھے بھاری مشکل میں ڈال دیا۔ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ گو وہ ذکر کرنا اچھا چاہے ہیں ۔۔۔۔۔"

رمیش نے انہیں درمیان ہی میں روک کر کہا : "میں نہیں جاننا کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں اور جاننا بھی نہیں چاہتا۔ آپ جو کچھ کہیں گی وہی ہو گا۔"

اچانک رمیش کی باتوں میں قدرے خفگی کے آثار دیکھ کر وشنو لشوری دل ہی دل میں حیران ہوئیں۔ کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا : "لیکن رمیش، اس وقت تو کہتے تھے کہ یہی سب تمہارے لئے سب سے بڑھ کر اپنے ہیں۔ خیر، کچھ بھی ہو۔ لیکن ہم عورتوں کے کہنے سے کیا ہوگا بیٹیا؟ اس گاؤں میں اور صرف اسی گاؤں میں کیوں، ہر گاؤں میں ایسا ہوتا ہے کہ یہ ان کے ساتھ نہیں کھاتے اور وہ ان کے ساتھ نہیں کھاتے۔ جیسے ہی کوئی کام آپڑتا ہے کہ انسان کے تفکرات کی حد نہیں رہتی۔ گاؤں میں اس سے بڑھ کر مشکل کام اور کوئی نہیں ہوتا کہ کسے چھوڑا جائے اور کسے رکھا جائے۔"

رمیش کو کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان دو ہی چار دنوں میں انہیں بہت سی باتوں کا علم ہو گیا تھا۔ پھر بھی پوچھا "آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

وشنو لشوری نے کہا : "بیٹا بہت سی باتیں ہیں۔ اگر یہاں رہو گے تو خود بخود سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ کسی کا واقعی کچھ قصور ہوتا ہے اور کسی پر یونہی جھوٹ موٹ کسی قصور کا الزام لگا دیا جاتا ہے اور پھر معاملے مقدموں اور جھوٹی گواہیوں کے باعث بھی بڑی بڑی گروہ بندیاں ہوتی ہیں۔ رمیش اگر میں دو دن اور پہلے تمہارے یہاں پہنچ جاتی تو تمہیں کبھی اتنا بکھیڑا نہ کرنے دیتی۔ اب تو بس یہی سوچ رہی ہوں کہ اس دن کیا ہوگا!"

یہ کہہ کر تائی جی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ رمیش نے کہا : "لیکن میرے

ساتھ تو ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں ہیں تو ایک طرح سے پردیسی ہی کہا جا سکتا ہوں۔ جس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں۔ تائی جی! اسی لئے میں کہتا ہوں کہ میں یہاں کی گروہ بندیوں کا کوئی خیال نہ کروں گا۔ سب برہمنوں اور شودروں کو دعوت دوں گا لیکن آپ کے حکم کے بغیر تو کچھ کر نہیں سکتا۔ اس لئے آپ حکم دیدیں۔

تائی جی نے تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اور کچھ سوچ کر کہا "لیکن رمیش! اس طرح کا حکم میں نہیں دے سکتی۔ اس سے بے حد گڑبڑ مچ جائے گی۔ لیکن میں یہ بھی نہیں کہتی کہ تمہارا کہنا ٹھیک نہیں۔ لیکن بیٹا! یہ صرف درست اور غلط کی بات نہیں۔ سماج نے جسے سزا دیکر الگ کر رکھا ہے۔ اسے کسی طرح زبردستی سماج میں نہیں ملایا جا سکتا۔ سماج خواہ کیسا ہی ہو۔ لیکن اسے ماننا پڑتا ہے ——

رمیش۔ اس طرح تو کبھی کام نہیں چل سکتا۔

اس بات پر غور کر کے رمیش اسے نامنظور نہ کر سکتا تھا۔ لیکن ابھی ابھی باہر اس سماج کے معزز ارکان کی جو ذلالت اور فریب دہی اس نے دیکھی تھی وہ اس کے دل میں آگ سی سلگا رہی تھی۔ اسی لئے اس نے نفرت کے جوش میں کہہ ڈالا "اس گاؤں کے سماج میں یہی گووند، دھرم داس وغیرہ ہی ہیں نا تائی جی! اگر ایسے سماج کی نام کو بھی کوئی عزت نہ رہے تو بہتر ہے۔"

تائی جی نے رمیش کی ناراضگی دیکھی لیکن اسی متین لہجے میں بولیں "رمیش! صرف یہی لوگ نہیں۔ بلکہ تمہارے بڑے بھیا دینی بھی اسی سماج کے کرتا دھرتا ہیں۔"

رمیش خاموش رہے۔ تائی جی نے پھر کہنا شروع کیا "رمیش اسی لئے میں کہتی ہوں کہ تم لوگ ان لوگوں کی رائے لے کر کام کرو۔ گھر میں قدم رکھتے ہی ان لوگوں کے خلاف جانا اچھا نہیں۔"

رتیش نے کہا "تائی جی ابھی آپ ہی نے کہا ہے کہ مختلف وجوہ سے یہاں گروہ بندیاں ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سب سے بڑی وجہ ذاتی رنجش ہے۔ ——— اور پھر اس کے علاوہ جب میں سیج یا حدیث کسی کے بھی قصور کی بات نہیں جانتا تو کسی کو بھی الگ کر کے اس کی بے عزتی کرنا میرے لئے ناانصافی ہوگی۔"

"تائی جی نے قدرے ہنس کر کہا "پاگل ہیں ہم تم سے بڑی ہوں۔ تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔ میری بات نہ سننا بھی تو ناانصافی ہے۔"

رتیش نے کہا "تائی جی - میں کیا کروں۔ میں تو فیصلہ کر چکا ہوں کہ سب کو بلاؤں گا۔"

رتیش کا عزم صمیم دیکھ کر وشولیشوری کا چہرہ اداس سا ہو گیا۔ انہوں نے کہا "جب تو تم خالی دکھاوے کے لئے میرا حکم لینے آئے تھے۔"

رتیش نے سمجھ لیا کہ تائی جی ناراض ہو گئی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ بے چین نہیں ہوئے۔ انہوں نے تھوڑی دیر بعد آہستہ سے کہا "تائی جی میں سمجھتا تھا کہ میرا جو کام خیر مصفانہ نہ ہوگا۔ اس میں آپ مجھے مسرت سے آشیرواد بھی دیں گی میرا ....."

لیکن بات ختم ہونے سے پہلے ہی وشولیشوری نے روک کر کہا "لیکن رتیش، انہیں یہ بھی تو جاننا چاہئے تھا کہ میں اپنے بیٹے کے خلاف نہیں جا سکوں گی۔"

اس بات سے رتیش کے دل پر چوٹ لگی۔ کیونکہ منہ سے وہ خواہ کچھ نہیں، لیکن نہ جانے کیونکر کل ہی سے ان کا دل تائی جی کے نزدیک اولاد ہی کا دعوے کرنے لگا تھا۔ لیکن اب انہوں نے دیکھا کہ اس دعوے سے بہت زیادہ بلندی پہ خود ان کی اولاد کا دعوے الگ بنائے بیٹھا ہے۔ وہ تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور دبی ہوئی ناراضگی کے انداز میں بولے:۔

" تائی جی، کل تک تو یہی سمجھتا تھا کہ اور اسی لئے آپ سے کہا تھا۔ کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا۔ وہ میں خود اکیلا ہی کروں گا۔ آپ آنے کی تکلیف نہ کریں۔

پہچانتی ہیں۔ ہماری آنکھوں میں کوئی خاک نہیں جھونک سکتا۔"
گووند غصے کے مارے پاگل ہو کر چیخے۔ "آ تو حرامزادی"
لیکن "حرامزادی" ذرا نہ ڈری، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہاتھ منہ سے ہٹاتی ہوئی بولی "ارے تو کیا مجھے مارے گا؟ میں کہہ دیتی ہوں کہ جو کنیتی برہمنی کے منہ آئے گی اس کی خیر نہ ہو گی میری لڑکی نے رسوئی گھر کے اندر پاؤں تو رکھا ہی نہ تھا کہ گالا رہ خواہ مخواہ اس کی بے عزتی کرتے۔ کیا ان کی سمدھن کی چولہے کے ساتھ پیدا ہوئی تھی؟ میں کوئی آج کی تو ہوں نہیں۔ ابھی اور کچھ کہوں یا اسی سے کام چل جائیگا؟"
رتھیش کو تو سکتہ مار گیا۔ بیچارہ گھبرا کر اور اس کا ہاتھ پکڑ کر منتیانہ لہجہ میں بولے "اسے موسی اتنا ہی بہت ہے۔ اور ضرورت نہیں۔ اٹھو بیٹی سکماری اٹھو چلو میرے ساتھ اس کمرے میں جا کر بیٹھنا۔"
ادھر پران گالا نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا اور کھڑے ہو کر کہا "جب تک یہ طوائف اس گھر سے باہر نہیں نکال دی جائیگی۔ میں یہاں پانی تک نہیں پیؤں گا" گووند! کالی چرن! تم اگر اپنے ماموں کو چاہتے ہو تو اسے نکال دو۔ ذہنی گھوشال نے تو اسی وقت کہہ دیا تھا کہ ماموں جان وہاں نہ جانا۔ اگر میں جانتا کہ یہاں اسی طرح کی طوائفیں اکٹھی ہونگی اور اس طرح کا بکھیڑا کریگی تو کیسے اپنا ذات اور دھرم کھو بیٹھنے کو میں یہاں ملانے کے لئے کبھی اس گھر میں قدم رکھ سکتا؟ ۔۔۔۔۔۔ کالی اٹھو۔"
ماموں کے بار بار کہنے پر بھی کالی چرن سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ کالی چرن پاٹشالہ کا کاروبار کرتا تھا۔ تقریباً چار برس پہلے محلے کا ایک سرمایہ دار کا یک اس کی چھوٹی بیوہ بہن کو بھگا لے گیا تھا۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ پہلے کئی دن تک یہ کہہ کر بات چھپائی گئی کہ وہ اپنی سسرال گئی ہے اور پھر وہاں سے

تیرتھ یاترا وغیرہ ——— بحال چرن اسی خوف سے سر نہیں اٹھاتا تھا کہ کہیں اتنے
دنوں کے بعد یہ داستان پھر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ لیکن گوبند کو جو آگ لگی تھی
وہ ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ وہ پھر اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور زور زور سے چلا کر کہنے لگے۔
"خواہ کوئی کچھ بھی کیوں نہ کہے۔ یہاں کے چودھری ہیں۔ تربینی گھوشال، پران مالدار
اور جادو ناتھ مکرجی کی لڑکی۔ ہم لوگ انہیں کسی طرح نہیں چھوڑ سکتے۔ جب تک رمیش
بھیا اس بات کا جواب نہ دیں گے کہ انہوں نے برادری کی منظوری کے بغیر ان دونوں
بدمعاش عورتوں کو کیوں گھر میں آنے دیا، اس وقت تک ہم میں سے کوئی یہاں پانی
نہ پئے گا۔"

دیکھتے دیکھتے اور دس پانچ آدمی کندھے پر دوپٹہ رکھ رکھ کر کھڑے ہو گئے۔
یہ سب لوگ دیہاتی تھے۔ اور خوب سمجھتے تھے کہ معاشی کاموں میں کس وقت کونسی
چال سب سے زیادہ فائدہ بخش ہوتی ہے۔

باقی برہمنوں میں سے جس کے جی میں آیا کھسکنے لگا۔ بھیرو اور دینو بھٹاچاریہ تو
بالکل رونے والے ہو گئے۔ وہ کبھی تو کھینچتی ہوئی اور اس کی لڑکی کے اندر بھی گنگولی
اور مالدار کے ہاتھ پیر پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن رمیش ایک بھی بات نہ کہہ
سکے۔ ایک تو بھوک پیاس سے ان کی حالت پہلے ہی خراب ہو رہی تھی۔ اس پر اچانک
یہ جھگڑا ابھر گیا۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اور وہ حیران دستششدر سے خاموش
کھڑے دیکھتے رہے۔

اتنے میں آواز آئی "رمیش!"

اچانک لمحہ بھر میں سب لوگوں کی متحیر نگاہیں وشویشوری کے چہرے پر جا پڑیں۔
وہ بھنڈار سے باہر نکل کر دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سر پہ
تو آنچل تھا لیکن منہ کھلا تھا۔ رمیش نے دیکھا کہ تائی جی خود ہی نہ جانے

کب آگئی ہیں، انہوں نے مجھے چھوڑا نہیں دیا۔ باہر کے لوگوں نے بھی دیکھا کہ یہی وشو لیشوری ہیں اور یہی گھوشال کے گھر کی مالکن ہیں۔

گاؤں میں شہروں کی طرح سخت پردہ نہیں ہوتا ——— پھر بھی وشو لیشوری خواہ بڑے گھر کی عورت ہونے کے باعث ہو یا کسی اور وجہ سے عام طور پر کسی کے سامنے نہیں نکلتی تھیں۔ اسی لئے آج انہیں دیکھ کر سب کو بے حد حیرت ہوئی۔ جن لوگوں نے صرف سنا ہی تھا اور کبھی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ وہ ان کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بالکل ششدر رہ گئے۔ غالباً اچانک غصہ آجانے کی وجہ سے وہ باہر آگئی تھیں۔ جونہی لوگوں نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا، وہ ستون کی آڑ میں چلی گئیں۔ ان کی صاف اور تیز آواز سنتے ہی رمیش کی تمام بے قراری نہ جانے کہاں چلی گئی۔ وہ آگے بڑھ کر ان کے پاس جا پہنچے۔ تائی جی نے آڑ میں سے اسی صاف اور تیز آواز میں کہا: "گنگولی مہاشے کو منع کر دو کہ اس طرح نہ ڈرائیں دھمکائیں اور بالدا جی سے میرا نام لے کر کہہ دو کہ میں سب کو عزت و احترام سے بلا کر اپنے گھر لایا ہوں۔ شکاری کی بے عزتی کرنے کی انہیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے کام کاج کے گھر میں کوئی شور غل اور گالی گلوج نہ کرے۔ جن لوگوں کو اس میں تکلیف ہو وہ اور کہیں چلے جائیں۔"

بڑی مالکن کا یہ سخت حکم سب لوگوں نے اپنے کانوں سے سنا۔ رمیش کو اپنے منہ سے کچھ بھی نہ کہنا پڑا۔ اگر انہیں کہنا پڑتا تو شاید وہ کبھی نہ کہہ سکتے۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ کھڑے ہو کر اسے دیکھ بھی نہ سکے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ تمام بوجھ تائی جی نے اپنے سر لے لیا ہے۔ تو وہ کسی طرح اپنے آنسوؤں کو روک کر جلدی سے کوٹھڑی میں جا پہنچے وہاں ان کی آنکھوں سے جھر جھر آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگیں آج صبح ہی

سے وہ کام میں بے حد مصروف تھے۔ اس لئے وہ اس بات کی بھی خبر نہ لے سکے کہ کون آیا ہے اور کون نہیں آیا ــــــ اور خواہ کوئی آئے۔ لیکن انہیں اس بات کا خواب و خیال بھی نہ تھا کہ تائی جی آ سکتی ہیں۔ جو لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے وہ آہستہ آہستہ بیٹھ گئے۔ صرف گووند گنگولی اور پران بالدار بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ اس ہجوم میں کسی نے دھیمی آواز میں کہا "چچا! بیٹھ جاؤ نا! کھلا پلا کر سولہ سولہ پوریاں اور آٹھ آٹھ سندیش کون دیتا ہے!"

پران بالدار تو آہستہ آہستہ باہر چلے گئے۔ گووند گنگولی سچ مچ ہی بیٹھ گئے۔ ہاں! ان کا منہ ضرور آخر تک بھاری ہی بنا رہا ــــــ اور جب کھانے کے لئے پتلیں بچھیں، تو دیکھ بھال کا بہانہ کر کے وہ کھانے میں نہیں بیٹھے۔ اس کے بعد اور کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اس دن برہمنوں نے جو کھانا کھایا اس پر آنکھوں دیکھے بغیر یقین کرنا دشوار ہے۔ سب لوگوں نے اپنے گھر کے آدمیوں ــــــ لڑکوں، بالوں، بچوں بچیوں کے نام سے جو کچھ باندھا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ شام کے بعد سب کام دھندا ختم ہو گیا۔ رمیش صدر دروازے کے باہر امرود کے ایک پیڑ کے نیچے بے دلی سے کھڑے تھے۔ ان کا جی ٹھکانے نہ تھا۔ اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ دینو بھٹا چاریہ اپنے لڑکے لڑکیوں کو ساتھ لئے، پوری مٹھائی کے بوجھ سے جھکے ہوئے اور حتی الامکان سب کی نظر بچاتے ہوئے باہر نکل رہے ہیں۔ سب سے پہلے ان کی لڑکی کی نظر رمیش پر پڑی۔ وہ مجرموں کی طرح سہم کر کھڑی ہو گئی۔ اور آہستہ سے بولی "بابا! دیکھو بابو جی کھڑے ہیں۔"

سب کو گویا کاٹھ مار گیا۔ اس معصوم لڑکی کی اس ایک بات ہی سے رمیش نے سب باتیں اچھی طرح سمجھ لیں۔ اگر بھاگنے کی جگہ ہوتی تو وہ خود ہی اس وقت وہاں سے بھاگ جاتے۔ لیکن بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس لئے

بھٹا چاریہ نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بھیا اس کا علاج کیا ہو
سکتا ہے ، یہ ٹھیک جو لکھا ، لیکن پھر بھی بھیا جی میں ایک بات کہہ سکتا ہوں ۔ مجھے
تو بھگت کے لئے بہت سی جگہ جانا پڑتا ہے اور بہت سے لوگ مجھے بُرا بھلا بھی کہتے
ہیں ـــــ اور بہت سے ہمدردی سے بھی پیش آتے ہیں ۔ میں نے خوب دیکھا
ہے کہ آپ ایسے نوجوانوں میں دیا دھرم پھر بھی ہے ـــــ اگر نہیں ہے تو صرف
ان ٹھیکوں میں ۔ یہ لوگ جہاں موقعہ پاتے ہیں ، آدمی کے گلے پہ پاؤں رکھ کر کھڑے
ہو جاتے ہیں اور جب تک اُس کی زبان اس طرح باہر نکل آئے اس وقت تک
اس کی جان نہیں چھوڑتے ۔"

یہ کہہ کر ڈیبو نے ایسے طریقے سے زبان باہر نکال کر دکھائی کہ رتیش کو ہنسی
آگئی ۔ لیکن ڈیبو اس ہنسی میں شامل نہ ہوئے ، اور بولے "بھیا جی ہنسی کی بات
نہیں ، یہ بالکل سچ ہے ۔ میں پہلے بہت بوڑھا ہو گیا ہوں ، لیکن ـــ بھیا جی
آپ تو اندھیرے میں بہت دور نکل آئے ۔"

رتیش نے کہا "کوئی فکر نہیں ہونا چاہیے جی ۔ آپ کہتے چلیں ۔"

ڈیبو نے کہا "بھیا جی میں اور کیا کہوں ۔ ہر گاؤں میں یہی حال ہے ۔ یہ
جگو تو نکڑ ہی سے بس کم بخت کے باپ کی بات زبان پر لاؤں تو پرانشچت
کرنا پڑے ۔ کھیتی برہمنی نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھوڑے ہی تھا ۔ لیکن اس
سے سب ڈرتے ہیں ۔ جعلسازی میں ، جھوٹی گواہی دینے میں ، جھوٹا مقدمہ
بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ۔ لیکن دیکھی بابو اس کی لیاقت دنیا میں ہی اسی
لئے کسی کو اس کے خلاف ایک بات کہنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی ۔ بلکہ الٹا یہ
لوگوں کو ذات برادری سے باہر کرتا پھرتا ہے ۔"

رتیش دیر تک اور کوئی سوال کئے بغیر چپ چاپ ڈیبو کے ساتھ ساتھ چلتے

رہے۔ غصے کے مارے ان کا بدن چھلکا جا رہا تھا۔ بھٹا چاریہ آپ ہی آپ کہنے لگے "بھیا جی! آپ میری بات یاد رکھیے گا۔ اِس کھینتی پر بہنی کا آسانی سے چھٹکارا نہ ہوگا۔ گوونڈ گنگولی اور پران ہالدار ——— وودو بوڑھوں کی حیثیتوں کو چھیڑنا کیا کوئی معمولی بات ہے؟ لیکن کچھ بھی کہو بھیا جی اس عورت میں بڑی ہمت ہے ——— اور پھر ہمت کیوں نہ ہو؟ وہ اپنا کام کر کے گزارہ کرتی ہے۔ سب گھروں میں اس کا آنا جانا ہے۔ سب کی سب باتوں کا پتہ رکھتی ہے۔ میں کہے دیتا ہوں کہ اس کے اس طرح پیچھے پڑ جانے سے ان کی بدنامی کی حد نہ رہے گی۔ بھیا آپ ہی بتائیے کہ بُری باتیں کس گھر میں نہیں؟ دینی بابو کو بھی"

رتیش نے اس خوف سے کہ یہ نہ جانے کیا کہے گا۔ درمیان ہی میں روک کر کہا "رہنے دیجئے۔ بڑے بھیا کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں" دینو نے بھی لا جواب ہو کر کہا "ہاں، رہنے دو بھیا جی میں بھی غریب آدمی ہوں۔ مجھے کسی کی بات میں پڑنے کی کیا ضرورت اگر کوئی دینی بابو سے جا کر کہہ دے تو وہ میرا گھر ہی جلوا . . . " رتیش نے پھر روک کر پوچھا "کیوں بھٹا چاریہ جی! آپ کا گھر کیا ابھی زیادہ دور ہے؟"

"نہیں بھیا! زیادہ دور نہیں۔ اس بند کے پاس ہی میری جھونپڑی ہے اگر کسی دن ———"

"آؤں گا کیوں نہیں! ضرور آؤں گا۔ ابھی تو کل صبح پھر آپ سے ملاقات ہوگی لیکن اس کے بعد بھی کبھی کبھی اپنے قدموں کی خاک بخشتا رہیے گا"

یہ کہہ کر رتیش وہاں سے لوٹ پڑے۔ دینو بھٹا چاریہ نے بھی انہیں اپنے دل سے آشیرواد دیا ——— بھیا! دیر تک زندہ رہو۔ اپنے باپ کی طرح بڑو!

اور پھر وہ اپنے لڑکوں کو ساتھ لے اپنے گھر کی طرف چلے گئے ———!

(۵)

اس گاؤں میں مودی کی ایک ہی دوکان تھی اور وہ تھی مدھو پال کی یہ دوکان ..ہی کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھی جب دس بارہ دن گزر گئے۔ اور وہ اپنے بقایا دس روپے لینے نہ آیا تو رتنیش نہ جانے کیا سوچ کر ایکدن صبح خود ہی اس کی دوکان پر جانے کے لئے گھر سے نکلے۔ مدھو پال نے بڑی عزت سے برآمدے میں ایک مونڈھا رکھ کر اس پر چھوٹے بابو کو بٹھایا۔ چھوٹے بابو کے آنے کا مقصد سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کی اتنی عمر گزر گئی تھی۔ لیکن اس نے آج تک نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ سنا ہی تھا کہ کوئی اپنا بقایا چکانے کے لئے خود چل کر آیا ہو۔ باتوں میں کئی موضوع زیر بحث آگئے۔ مدھو نے کہا "بھلا بابو جی دوکان کیسے چل سکتی ہے؟ دو آنہ چار آنہ ایک روپیہ، سوا روپیہ کر کے تقریباً پچاس ساٹھ روپے لوگوں کی طرف باقی پڑے ہیں۔ کہہ تو جاتے ہیں کہ ابھی ادا کر دیئے جائیں گے لیکن دو دو مہینے تک ادا نہیں ہوتے ——— کون ہیز جی ہیں کیا؟ پر نام کہیئے کب آئے ہو؟"

ہیز جی کے بائیں ہاتھ میں ایک لوٹا تھا اور ان کے پاؤں کی انگلیوں اور ایڑیوں پر کیچڑ کے دھبے تھے۔ کان پر زنار لپٹا ہوا تھا۔ اور دائیں ہاتھ میں اروی کے پتے میں لپٹی ہوئی چار چھوٹی چھوٹی جھینگڑی مچھلیاں تھیں انہوں نے زور سے آہ کھینچتے ہوئے کہا "کل رات کو آیا ہوں مدھو، ذرا تمباکو تو پلاؤ بھیا۔"

یہ کہہ کر ہیز جی نے لوٹا اور مچھلیاں ایک طرف رکھ دیں اور کہا۔ "مدھو، تم نے اس لکھیا مچھیری کی عقل دیکھی؟ اس نے جھپٹ کے میرا

ہاتھ پکڑ لیا۔ دیکھو، دیکھتے ہی دیکھتے کیسا زمانہ بدل گیا ہے! اب یہ کیا ایک پیسے کی جنگڑی ہیں؟ بھلا برہمن کو ٹھگ کر یہ بڑھیا کتنے دن پیٹ بھرے گی؟ تباہ نہیں ہو جائے گی؟"

مادھو نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "کیا اُس نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا؟"

پنڈت جی نے غصے میں چاروں طرف دیکھ کر جوش سے کہا: "صرف ڈھائی پیسے اس کے باقی ہیں۔ کیا اس کے لئے وہ بازار بھر کے سامنے ہمارا ہاتھ پکڑ لے گی؟ بھلا بتاؤ، یہاں کون ایسا ہو گا جس نے نہ دیکھا ہو! میں نے آ کر ندی میں لوٹا مانجھا، ہاتھ پیر دھوئے اور سوچا کہ چلو ذرا بازار بھی ہوتا چلوں۔ وہ ایک ڈکری میں مچھلی لئے بیٹھی تھی۔ لیکن مجھے دیکھتے ہی کہا ——— مہاراج! آپ کچھ نہیں، وہ مچھلیاں سب بک گئیں۔ لیکن ہماری آنکھوں میں بھلا خاک جھونک سکتی تھی۔ جیسے ہی میں نے ڈکری دیکھنے کے لئے کپڑا اٹھایا، اس نے جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ بھلا میں اس کے ڈھائی پیسے پہلے اور ایک پیسہ ——— ساڑھے تین پیسے لے کر گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا! کیوں مادھو، کیا کہتے ہو؟"

مادھو نے بھی تائید کرتے ہوئے کہا: "ارے مہاراج! ایسا کہیں ہو سکتا ہے!"

پنڈت جی نے کہا: "بھلا اس گاؤں میں انصاف کہیں رہ گیا ہے؟ ورنہ اس کے گھر دھوبی، حجام، سب کا جانا بند کر دیا جاتا اور اس کا چھپر کاٹ کر گھر برباد کر دیا جاتا۔"

پھر اچانک تبیشن کی طرف دیکھ کر پوچھا: "مادھو، یہ بابو جی کون ہیں؟"

مادھو نے فخریہ انداز میں کہا: "یہ ہمارے چھوٹے بابو کے لڑکے ہیں۔ ابھی اس دن کے دس روپے باقی تھے۔ وہی ادا کرنے کے لئے گھر سے چل

میں بغیر کھائے بیمار چوہے کی طرح ہو گیا ہوں۔ دن رات پیٹ گڑ گڑ کرتا ہے۔ کلیجا جلتا رہتا ہے۔ دل گھبراتا رہتا ہے۔ بھاگ کر جب یہاں آیا تو کہیں جان میں جان آئی۔ نہیں، بھائی نہیں!! اپنے گاؤں میں رہ کر جو کچھ ملے گا ایک وقت کھا کر گزارہ کروں گا۔ وہ بھی نہ ملے گا۔ تو اپنے بال بچوں کو ساتھ لے کر بھیک مانگ لوں گا۔ برہمن کی اولاد کے لئے اس میں کوئی شرم کی بات نہیں لکشمی ماتا میرے سر آنکھوں پر لیکن کوئی پردیس نہ جانے!"

جب بھیز جی کی یہ داستان سن کر سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ تو وہ اٹھ کر تیل کے برتن کے پاس جا پہنچے اور پلی اٹھا کر برتن میں سے کوئی چھٹانک بھر تیل بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر ڈال لیا۔ پھر اس میں سے تھوڑا لے کر ناک اور کان میں ڈالا، باقی نصف سر پر مل لیا اور کہا "بہت دیر ہو گئی۔ اب بھاگ کر گھر چلنا چاہیئے۔ مدھو ایک پیسے کا نمک تو دیدو۔ پیسہ تیسرے پہر دے جاؤں گا۔"

"پھر وہی تیسرے پہر"۔ کہتا ہوا مدھو ناخوش چہرے سے نمک دینے کے لئے اٹھا۔ بھیز جی نے گردن بڑھا کر دیکھا اور حیرت و غضب کے انداز میں کہا:۔

"مدھو۔ تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ تو منہ پر تھپڑ مار کر پیسہ چھیننا ہے۔ دیکھوں؟"

یہ کہہ کر بھیز جی نے خود ہی آگے بڑھ کر ایک مٹھی بھر نمک اور اٹھا کر اور پڑیا میں ڈال کر اسے جھپٹ لیا۔ پھر لوٹا اٹھا کر رمیش کی طرف دیکھا اور قدرے مسکراتے ہوئے کہا "بھیا جی، یہ ایک ہی تو راستہ ہے۔ چلئے بات چیت کرتے چلیں گے!"

"چلئے!" کہہ کر رمیش بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مدھو نے قدرے فاصلے ہی پر کھڑے ہو کر پُرسوز لہجے میں کہا "بھیز جی مہاراج وہ آنے کا

پانچ آنہ پیسہ گیا۔۔"

بنیر جی بگڑ کر بولے ——— "کیوں جی مدھو! اب تو دونوں وقت آمد و رفت رہے گی۔ کیا تم لوگوں کی آنکھوں میں ذرا بھی لحاظ نہیں رہ گیا؟ جب ان بدبختوں کے پھیر میں پڑکر کلکتے آنے جانے میں پانچ روپے پانی میں بہہ گئے تو اب تمہارے تقاضے کا وقت آیا؟ اسی کو کہتے ہیں ——— کسی کی بربادی اور کسی کے پو بارہ دیکھتے ہو بھیا رتیش! ان لوگوں کا سلوک!"

مدھو شرمندہ سا ہوکر دبی زبان سے بولا "بہت دنوں کا ———"

"بہت دنوں کا ہے تو ہو۔ اس طرح تم سب مل کر پیچھے پڑ جاؤ گے تو پھر گاؤں میں رہنا ہی دشوار ہو جائیگا۔"

یہ کہہ کر وہ ایک طرح ناراض ہوکر بنیر جی اپنا سامان لے کر چلے گئے۔

رتیش وہاں سے لوٹ کر اپنے مکان کے دروازے پر پہنچے ہی تھے کہ ایک بھلے آدمی گھبرا کر اپنے ہاتھ کا حقہ ایک طرف رکھ کر آگے بڑھے اور جھک کر پرنام کیا۔ پھر اٹھ کر کہا "میرا نام بن مالی پانڈے ہے۔ میں آپ لوگوں کے سکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ دو ایک بار آچکا ہوں، لیکن آپ کے درشن نہیں ہوئے۔ اس لئے ——— " رتیش نے احترام سے انہیں کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ لیکن وہ ادب قاعدے سے کھڑے ہی رہے اور بولے "جی، میں تو آپ کا نوکر ہوں۔"

ایک تو ان کی عمر کافی تھی۔ اور پھر ایک وہ ایک اسکول کے مدرس تھے۔ ان کے اس عاجزانہ برتاؤ سے رتیش کے دل میں ان کی عقیدت کچھ ہوگئی۔ انہوں نے کسی طرح کرسی پر بیٹھنا منظور نہ کیا اور کھڑے ہی کھڑے اپنا مقصد بیان کرنا شروع کر دیا ———

"اس طرف بھی ایک چھوٹا سا سکول ہے مگر جی اور گاؤں والوں کی کوششوں سے یہ قائم ہوا تھا۔ تیس چالیس لڑکے پڑھتے ہیں۔ بعض دو دو تین تین کوس دور سے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی بہت سرکاری امداد بھی ملتی ہے۔ لیکن پھر بھی سکول چلنا مشکل نظر آتا ہے۔"

رمیش کو یاد آیا کہ لڑکپن میں اس نے بھی کچھ دنوں تک اس سکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پانڈے جی نے بتایا کہ اگر چھپر پھر سے ڈالا جائے گا تو آئندہ برسات میں کوئی مدرسہ بیٹھ سکے گا۔ لیکن اس کی فکر تو کچھ بعد میں بھی کی جا سکتی ہے۔ اس وقت سب سے بڑھ کر فکر کی بات یہ ہے کہ ادھر تین ماہ سے کسی مدرس کو تنخواہ نہیں دی گئی۔ اس لئے اب کوئی اپنے گھر سے کھا کر جنگل کے بھینسے نہیں ہانک سکتا۔"

سکول کی بات سے رمیش بالکل متوجہ ہو گئے۔ وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنے ساتھ لے کر بیٹھک میں چلے گئے اور پھر ان سے ایک ایک کر کے سب حال پوچھنے لگے۔ سکول میں چار مدرس ہیں۔ ان لوگوں نے بڑی محنت کر کے اوسطاً دو دو لڑکے ہر سال پرائمری کے امتحان میں پاس کرائے ہیں۔ ان کے نام اور پتے وغیرہ پانڈے جی اس طرح سنا گئے گویا حفظ کر رکھے ہوں۔ لڑکوں سے جو فیس وصول ہوتی ہے اس سے دو نچلے درجوں کے مدرسوں کی تنخواہ کا کام کسی نہ کسی طرح چل جاتا ہے اور سرکاری امداد سے ایک اور ماسٹر کا کام چل جاتا ہے۔ صرف ایک آدمی کی تنخواہ گاؤں اور آس پاس کے لوگوں سے چندہ کر کے جمع کی جاتی ہے۔ یہ چندہ وصول کرنے کا کام بھی ماسٹروں ہی کے ذمے ہے۔ ادھر لگاتار چار ماہ سے گھر گھر گھومنے پر اور ایک ایک آدمی کی طرف آٹھ آٹھ دس دس چکر لگانے پر بھی وہ سوا سات روپے سے زیادہ

وصول نہیں کر سکے۔

یہ سنکر رتیش حیران رہ گئے۔ وہ سوچنے لگے۔ کہ پانچ چھ گاؤں کے درمیان یہی ایک سکول ہے۔ اور ان پانچ چھ گاؤں میں چار مہینے تک گھومنے پر وصول ہوئے ہیں۔ صرف سوا سات روپے! رتیش نے پوچھا "آپکی تنخواہ کتنی ہے؟"

ماسٹر صاحب نے کہا "رسید تو چھبیس روپے کی دینی پڑتی ہے۔ لیکن ملتے ہیں صرف تیرہ روپے پر رہ آئے"

رتیش کی سمجھ میں یہ پہیلی بالکل نہیں آئی۔ اس لئے وہ ماسٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ ماسٹر صاحب نے ان کے دلی جذبات کو سمجھ کر کہا ——

" سرکاری حکم ہی ایسا ہے۔ اس لئے چھبیس روپے کی رسید لکھ کر سکولوں کے ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو دکھانی پڑتی ہے۔ ورنہ سرکاری امداد بند ہو جائے! یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ آپ کسی بھی طالب علم سے پوچھ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا"

رتیش نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا "اس سے طالب علموں کے سامنے آپ کی عزت و توقیر کم نہیں ہوتی؟"

ماسٹر صاحب نادم ہو کر بولے "کیا کریں رتیش بابو! دینی بابو تو اتنا بھی دینے پر راضی نہیں"

رتیش نے کہا "معلوم ہوتا ہے، وہی کرتا دھرتا ہیں"

ماسٹر صاحب کو دل سے قبول تو ضرور ہوئی لیکن وہ "نہیں" تو کہہ ہی نہ سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آہستہ آہستہ بتایا کہ "وہ سیکرٹری تو ہیں۔ لیکن کبھی ایک پیسہ بھی اپنے پاس سے خرچ نہیں کرتے۔ ہاں

بیڈ مسٹریس کی لڑکی بالکل لکشمی ہیں۔ اگر ان کی عنایت نہ ہوتی تو سکول کبھی کا بند ہو گیا ہوتا پہلے تو انہوں نے امید دلائی تھی کہ وہ اس سال اپنے خرچ سے چھپر ڈلوا دیں گی۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں یکایک انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا اور سب امداد بند کر دی ۔"

رمیش نے اشتیاق سے رما کے متعلق اور بھی کئی سوال کئے۔ اور آخر میں پوچھا "ان کا ایک بھائی بھی تو اس سکول میں پڑھتا ہے ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "وہی بیکن نہ ؟ ہاں پڑھتا کیوں نہیں ؟"

رمیش نے کہا "اچھا اب آپ کے سکول کا وقت ہو گیا ہے تو آپ جائیں کل میں آپ کے سکول میں آؤں گا۔"

"جو حکم!" کہہ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر ایک بار رمیش کو پرنام کیا۔ اور زبردستی ان کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگا کر چل دیئے ۔!

(۶)

وشو لیشوری کی اس دن کی بات اسی جنگل کی آگ کے مانند آس پاس دس پانچ گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ وہ تینی خود کسی کے منہ پر کڑی بات نہ کہہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ جا کر مرتہی کو بلا لائے تھے۔ سنتے ہیں کہ کسی زمانے میں گھٹک ناگ نے اپنا دانت گاڑ کر پیپل کا ایک بہت بڑا درخت جلا کر بالکل راکھ کر دیا تھا۔ یہ مرتہی بھی اس دن صبح سویرے گھر آ کر جو زہر اگل گئی۔ اس سے وشو لیشوری کا گوشت پوست کا جسم خواہ اس لئے کہ وہ لکڑی کا نہ تھا۔ یا اس لئے کہ اس زمانے میں اور اس زمانے میں بہت فرق ہو گیا ہے۔ جل کر راکھ نہیں ہوا۔ وشو لیشوری نے تمام تذلیل و تحقیر چپ چاپ برداشت کر لی۔ کیونکہ یہ بات ان سے پوشیدہ نہ تھی۔ کہ یہ سب کچھ ان کے بیٹے ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ وہ سوچتی تھیں کہ اگر میں نے غصے میں آ کر ایک بات کا بھی جواب دیا تو اس عورت کے منہ سے سب سے پہلے میرے لڑکے ہی کی بات ظاہر ہو جائے گی اور شاید وہ رمیش کے کانوں تک بھی جا پہنچے اسی شرم کے مارے وشو لیشوری اتنی دیر تک بالکل کاٹھ کی پتلی کے مانند بیٹھی رہیں۔

لیکن گاؤں دیہات میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔ رمیش نے بھی سن لی۔ اپنی تائی کے بارے میں شروع ہی سے ان کے دل میں ایک اشتیاق سا تھا۔ اور انہیں یہ شک بھی تھا کہ میرے باعث ماں بیٹے میں لڑائی جھگڑا بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ تینی باہر سے کسی کو اپنے گھر بلا کر اس سے اپنی ماں کی تحقیر و تذلیل کرائیں گے یہ بات انہیں بہت ہی انوکھی اور دنیا بھر سے نرالی معلوم ہوئی اور اس کے بعد فوراً ان کے غصے کی آگ ان کے جسم کو راکھ کرنے لگی۔ سوچا کہ مجھے اسی وقت

اس گھر میں پہنچایا جانا چاہئے۔ اور وہاں جو کچھ بُری بھلی منہ میں آئیں۔ رتنی کو سنانا چاہیئے کیونکہ جو آدمی اس طرح اپنی ماں کی بے عزتی کرا سکتا ہے۔ اس کی بے عزتی کرتے وقت کسی بات کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی خیال آیا۔ کہ یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس سے نائی جی کی اور تحقیر ہوگی۔ اس دن رتنو سے اور کل ماسٹر صاحب سے رتنا کے متعلق کچھ باتیں سن کر اس کے لئے ان کے دل میں عقیدت کا کچھ جذبہ پیدا ہوگیا تھا۔ جب انہیں پورا یقین ہوگیا کہ اس چاروں طرف پھیلی ہوئی جہالت اور تعصب میں ایک نائی جی کے دل کو چھوڑ کر باقی تمام گاؤں تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ تو اس مکرجی کے گھر کی طرف دیکھتے ہی انہوں نے روشنی کا نشان پایا تھا۔ پھر خواہ وہ نشان کتنا ہی معمولی اور ملوث ہو۔ اس سے ان کے دل میں بڑی مسرت ہوئی تھی۔ لیکن آج پھر اس واقعے سے رتنا کے متعلق ان کا دل نفرت و حقارت سے لبریز ہوگیا۔ ان کے دل میں اس کے متعلق ذرا بھی شک نہ رہا کہ ان دونوں عورتوں اور بھائی جی نے مل کر رتنی کا ساتھ دیا ہے اور نائی جی سے بے انصافی کی ہے۔ لیکن بہت کچھ سوچنے پر بھی ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ وہیں ان دونوں عورتوں کے خلاف یا خود رتنی کو کس طرح اور کیا سزا دے سکیں گے۔

اسی دوران میں ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ گاؤں کی جائدادیں ابھی تک ایسی تھیں۔ جو [illegible] تقسیم نہ ہوئی تھیں۔ اچاریوں کے گھر کے پچھواڑے [illegible] وہ بھی اسی طرح مشترکہ تھا۔ کسی زمانے میں بہت بڑا [illegible] نہ ہونے کے باعث بھر گئے [illegible] بہت چھوٹا سا رہ گیا تھا۔ ابھی [illegible] باہر سے لاکر پھینک دی جاتی تھیں [illegible] آپ سے آپ چونکہ دو طرح کی

مچھلیاں پیدا ہوتی تھیں، وہی ہوتی تھیں۔ بھیرو ہانپتے ہانپتے آ پہنچے۔ باہر جھنڈی منڈپ کے پاس ہی گھر کے دالان میں گوپال سرکار بیٹھے ہی کھانا کھا رہے تھے۔ بھیرو نے گھبرا کر کہا: "سرکار مہاشے! آپ نے اپنے آدمی نہیں بھیجے۔ لڑکے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔"

سرکار نے قلم کان میں کھونستے ہوئے سر اٹھا کر پوچھا: "کون پکڑ رہا ہے؟"

بھیرو نے کہا: "اور کون پکڑ والے گا؟ دینو بابو کا لڑکا کھڑا ہے۔ کچہری کا دربان بھی ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھتا آ رہا ہوں۔ صرف آپ ہی کے یہاں کا آدمی نہیں گیا۔ جلدی کسی کو بھیجیے۔"

لیکن گوپال نے کسی اضطراب کا اظہار کیے بغیر کہا: "ہمارے بابو جی مانس، مچھلی نہیں کھاتے۔"

بھیرو نے کہا: "وہ نہ کھائیں تو اس سے کیا ہوتا ہے! لیکن اپنا حصہ تو لینا چاہیے۔"

گوپال نے کہا: "ہم سب لڑکے تو چاہتے ہیں اور اگر بڑے بابو زندہ ہوتے تو وہ بھی ضرور چاہتے۔ لیکن چھوٹے بابو کچھ اور ہی طرح کے آدمی ہیں۔"

جب گوپال نے اس بات پر بھیرو کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے تو ہنستے ہوئے اور انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا: "اچھا، یہ جی ہے تو تھوڑی معمولی سی دو چار مچھلیوں کی بات ہے۔ جس دن دکان کی جنوبی سمت والا تالاب بھی سوکھ گیا تھا، ان دونوں گھروں نے اسے آپس میں بانٹ لیا اور ہم لوگوں کو اس میں سے ایک چھلکا بھی نہ ملا۔ میں نے فوراً آ کر بابو جی کو سب باتیں بتائیں۔ وہ کتاب پڑھ رہے تھے۔ صرف ایک بار ذرا سا سر اٹھا کر کہا۔

اور قادر سے مسکرا کر پھر کتاب پڑھنے لگے۔ میں نے پوچھا بھی کہ سرکار کیا کرنا چاہئے لیکن ہمارے رمیش بابو کو پھر ذرا سا سر اٹھانے کی بھی فرصت نہ ملی جب میں نے کئی بار زور دیکر کہا۔ تو انہوں نے کتاب موڑ کر رکھدی اور ایک جماہی لیکر کہا۔ لکڑی کے لئے کہتے ہو۔ کیا ہمارے یہاں املی کا اور کوئی پیڑ نہیں؟ میں نے کہا۔ ہے کیوں نہیں؟ لیکن جو اپنا واجبی حصہ ہے، وہ کیوں چھوڑا جائے اور کون اس طرح اپنا حصہ چھوڑ دیتا ہے؟ رمیش بابو نے کتاب کچھ اور بھی موڑ کر رکھدی اور تقریباً پانچ منٹ تک خاموش رہنے کے بعد کہا ـــــ یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن دو چار معمولی لکڑیوں کے لئے جھگڑا نہیں کیا جاتا۔"

بھیرو نے انتہائی حیرت زدہ ہو کر کہا: "ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

گوپال سرکار نے مسکرا کر ذرا سر ہلاتے ہوئے کہا: "آچاریہ جی! میں جو کچھ کہتا ہوں۔ سو فی صدی سچ کہتا ہوں۔ میں نے اسی دن سب سمجھ لیا اب کیوں فضول بار بار کہا جائے؟ اس چھوٹے گھر کی لکشمی تو تارنی گھوشال کے ساتھ ہی غائب ہو گئی۔"

بھیرو نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "لیکن وہ تالاب میرے گھر کے پچھواڑے ہے اس لئے مجھے تو یہاں اطلاع دینا ہی چاہیئے۔"

گوپال نے کہا: "تو پھر مہاراج اچھی بات ہے۔ آپ بھی جا کر انہیں ذرا اطلاع دے دیجئے۔ دن رات کتابیں پڑھتے رہنے سے اور حصہ دار دل سے اس طرح ڈرنے سے کہیں زمین جائداد کی حفاظت ہوتی ہے؟ گوندگنگولی جی کی لڑکی تو عورت ہے۔ لیکن وہ بھی ان کی باتیں

سنگر ہنستی ہے۔ اس دن اس نے گوندنگلوں کو بلاکر کچھ ہنسی اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ آپ جاکر رمیش بابو سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی ساری جائداد ہمارے ہاتھ سونپ دیں اور ہم سے کچھ روپیہ ماہوار لے لیا کریں۔ بھلا اس سے بڑھ کر شرم کی بات اور کونسی ہو سکتی ہے؟"

یہ کہہ کر گوپال سرکار غصے اور دکھ کے مارے منہ پھلا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

گھر میں کوئی عورت تو تھی ہی نہیں۔ سب جگہ کھلا دربار تھا۔ بھیرو نے اندر پہنچ کر دیکھا کہ رمیش سامنے والے برآمدے میں ایک ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ رمیش کو ان کی ادائیگی قرض کے لئے ابھارتے ہوئے بھیرو نے دولت جائداد کی حفاظت کے متعلق ایک معمولی سی تمہید باندھ کر جونہی اصل بات بتائی۔ رمیش بندوق کی گولی کھا کر سوئے ہوئے شیر کی طرح گرج کر بولے "کیا سدا بندھا رے ساتھ اسی طرح چالبازی ہوا کرے گی؟ بھجوا؟"

ان کا یہ غیر معمولی جوش دیکھ کر بھیرو گھبرا گئے۔ اور وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے کہ یہ چالبازی کس کی ہے؟ بھجوا ضلع گورکھپور کا رہنے والا رمیش کا معتمد اور بے حد طاقتور نوکر تھا۔ لاٹھی چلانے میں وہ رمیش کا شاگرد تھا۔ بھجوا کے آتے ہی رمیش نے اسے کڑا حکم سنایا کہ جا کر سب مچھلیاں چھین لاؤ۔ اور کوئی روک سکے تو اس کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے یہاں لے آؤ۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس کا ایک جبڑا ضرور ہی توڑ آؤ۔"

بھجوا تو یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی تیل پلائی لاٹھی لانے کے لئے چپ چاپ اندر چلا گیا۔ یہ دیکھ کر بھیرو خوف کے مارے کانپنے لگے۔ وہ بنگال کے تیل پانی کے آدمی تھے۔ چیخ پکار اور بک جھک سے تو بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ لیکن جب وہ ہنگامہ کتا: ذکر کچھ کہے سنے صرف ایک بار سر ہلا کر چلا گیا تو ڈر کر خوف کے مارے

ان کا حلق خشک ہو گیا۔ انہیں یاد آ گیا کہ جو کتا بھونکتا نہیں۔ وہ ضرور کاٹتا ہے۔ بھیرد حقیقت میں خیر اندیش تھے۔ اس لئے وہ جتلانے آئے تھے۔ کہ اگر مین مرتع پر پہنچکر کچھ تکرار اور چیخ پکار کی جائے گی۔ تو کچھ چھوٹی موٹی مچھلیاں گھر لائی جا سکیں گی۔ وہ خود بھی اس سلسلے میں مدد کرنے کی سوچ کر آئے تھے۔ لیکن کہاں! کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ گوال گلتج کے راستے گیا ہی نہیں۔ بس مالک نے ایک بار للکار دیا اور نوکر نے زبان تک نہیں ہلائی۔ سیدھا لاٹھی لینے چلا گیا۔ بھیرد ٹھہرے غریب آدمی۔ فوجداری میں پھنسنے کی ان میں ہمت نہ تھی اور نہ خواہش ہی۔ تھوڑی ہی دیر بعد بھجوا ہاتھ میں ایک موٹی اور لمبی لاٹھی لئے نکلا۔ پہلے تو اس نے وہ لاٹھی ماتھے سے لگائی اور پھر دور ہی سے رتیش کو نمسکار کر کے چلنے لگا۔ بھیرد اچانک رونے لگے۔ اور رتیش کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بولے "ارے بھجو رک جاؤ ——— بھیا رتیش! معاف کرو۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میری جان نہیں بچے گی۔"

رتیش نے چڑ کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے ان کے تحیر کا ٹھکانا نہ رہا۔ بھجوا لوٹ پڑا اور حیران ہو کر کھڑا ہو گیا۔ بھیرد گریہ آلود گلے سے کہنے لگے "بھیا یہ بات چھپی نہ رہے گی۔ اگر رتیش بابو مجھ سے بگڑ گئے تو پھر میرے لئے ایک دن زندہ رہنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ میرا گھر بار تک جلا ڈالا جائے گا۔ اس وقت بھیا اور دستو بھی آ کر میری مدد نہ کر سکیں گے۔" رتیش سر جھکا کر خاموش بیٹھ گئے۔ شور سنکر گوپال سرکار بیا ہی کھانا چھوڑ کر آ پہنچے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا "ہاں بھیا جی۔ ان کا کہنا ٹھیک ہے۔"

لیکن رتیش نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ہاتھ سے انہوں نے بھجوا کو اپنے کام پر جانے کا اشارہ کر دیا اور خود چپ چاپ اندر چلے گئے۔ ان کے دل میں بھیرد اچاریہ کا بیہودہ خوف اور درناک نخرے تیز آندھی کی طرح طوفان اٹھانے لگے۔

(۷)

"کیوں رے ییتن کھیل رہا ہے! سکول نہیں جائیگا؟"

"ہمارے یہاں آج اور کل دو دن کی چھٹی ہے بہن!"

موسی نے یہ سنکر اپنا بگڑا ہوا منہ اور بھی بگاڑ کر کہا "آگ لگے ایسے سکول میں جہاں مہینے میں پندرہ دن چھٹی ہوا کرتی ہے۔ پھر بھی تم اس کے لئے اتنے روپے خرچ کرتی ہو! میں ہوتی تو آگ لگا دیتی"

یہ کہہ کر موسی اپنے کام سے چلی گئی۔ جو لوگ موسی کو سرلتا نے دروغ بافی ... تمام طرح کہہ کر چاروں طرف اسے بدنام کرتے پھرتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔ وہ اس طرح کی ایک آدھ سچی بات بھی کہہ سکتی تھی۔ اور ضرورت پڑنے پر دوسروں سے کہنے میں پیچھے ہٹنے والی نہ تھی۔ رتا نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس کھینچ لیا اور آہستہ سے پوچھا "کیوں رے ییتن۔ آج کس بات کی چھٹی ہے؟"

ییتن (جتندر) اپنی بہن کے ساتھ الگ ہو کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "دیدی! ہمارے سکول میں نیا چھپر چھوڑا جا رہا ہے۔ اس کے بعد سفیدی بھی ہوگی۔ نہ جانے کتنی کتابیں آئی ہیں۔ چار پانچ کرسیاں اور میز، ایک الماری اور ایک بہت بڑی گھڑی آئی ہے بہن! کسی دن تم بھی چل کر دیکھ آؤ نہ!"

رتا نے انتہائی حیران ہو کر کہا "ارے تو کیا کہہ رہا ہے!"

جتندر نے کہا "ہاں بہن! میں بالکل ٹھیک کہتا ہوں۔ رتیش بابو آئے ہیں نہ دیدی۔ یہ سب کر رہے ہیں"

اس سے آگے وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ سامنے سے موسی کو آتے دیکھ کر رتا اسے جلدی سے لیکر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس نے اپنے

بھائی کو بڑے پیار سے بٹھا کر اور اس سے سوال کر کے رتھیل اور سکول کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کریں۔ یہ بھی سُنا کہ وہ خود بھی روز آکر گھنٹہ دو گھنٹے پڑھا جاتے ہیں۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھی "کیوں ببتن! وہ تجھے پہچانتے ہیں؟"

بچے نے سر ہلا کر کہا "ہاں"

"تو انہیں کیا کہہ کر پکارتا ہے؟"

اب جلندر کو مشکل میں پڑ گیا، کیونکہ ابھی تک اتنی بے تکلفی کا موقعہ یا حوصلہ اسے نہ ہوا تھا۔ ان کے سکول میں آتے ہی تھر تھر ہیڈ ماسٹر صاحب بھی جس طرح چُپ چاپ الگ کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُسے دیکھ کر طلبا کے خوف اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہتی تھی۔ پکارنا تو دور رہا۔ کوئی ہمت کر کے اُن کے منہ کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ لیکن اپنی بڑی بہن کے سامنے یہ تسلیم کرنا بھی تو آسان نہ تھا۔ لڑکوں نے سنا تھا کہ سب ماسٹر انہیں "چھوٹے بابو" کہتے ہیں اس لئے اس نے عقل خرچ کر کے کہا "ہم سب اُنہیں چھوٹے بابو کہتے ہیں"

لیکن اس کے چہرے کے آثار دیکھ کر کوئی بات رما سے پوشیدہ نہ رہی۔ اس نے اپنے بھائی کو اور بھی اپنی گود کی طرف کھینچ کر ہنستے ہوئے کہا "چھوٹے بابو کیسا ہوتا ہے رے؟ وہ تیرے بھیا ہوتے ہیں۔ جس طرح دینو بابو کو تو بڑے بھیا کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح انہیں چھوٹے بھیا کہہ کر کیوں نہیں بلاتا؟" بچہ حیرت و مسرت سے بے قرار ہو کر بولا "وہ ہمارے بھیا ہوتے ہیں؟ سچ کہتی ہو بہنا؟"

"ہاں، بھیا ہی تو ہوتے ہیں"

یہ کہہ کر رما قدرے ہنسی۔ لیکن اب جلندر کو روکے رکھنا مشکل ہو گیا وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے۔ یہ خبر اپنے ساتھیوں تک پہنچا دے۔

لیکن سکول تو بند ہے، دو دن تک اسے جس طرح بھی ہو ضبط کرنا ہی پڑیگا ۔ تاہم جو لڑکے اس پاس رہتے ہیں ، ان سب کو خبر دیئے بغیر کیسے رہیے ! اس نے پھر نکلنے کے لئے چھٹپٹا کر کہا " تو اب جاؤں بہن ؟"

لیکن رتنا نے یہ کہکر اسے روک لیا کہ اس وقت تو کہاں جائیگا ۔ جب جتندر جا نہ سکا تو کچھ دیر تک ناخوش ہو کر منہ لسورے بیٹھا رہا ۔ پھر پوچھا " وہ اتنے دنوں تک کہاں تھے ؟"

رتنا نے محبت آمیز لہجے میں کہا " اتنے دنوں تک وہ پڑھنے کے لئے پردیس گئے ہوئے تھے ۔ بڑے ہو جاؤ گے تو تمہیں بھی اسی طرح پڑھنے کے لئے پردیس جا کر رہنا پڑے گا ۔ تم مجھے چھوڑ کر اکیلے پردیس میں رہ سکو گے نہیں ؟"

یہ کہکر رتنا نے پھر اپنے بھائی کو کھینچکر گلے سے لگا لیا ۔ بچہ ہونے پر بھی اپنی بہن کی آواز میں ایک طرح کا تغیر محسوس کر کے وہ حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا ۔ بات یہ تھی کہ رتنا اگرچہ اپنے بھائی کو جان سے بھی بڑھکر چاہتی تھی ۔ تاہم اس کی باتوں اور برتاؤ میں اس طرح کا جوش پہلے کبھی نہ ہوتا تھا ۔

جتندر نے پوچھا " کیوں بہن ، چھوٹے بھیا کی ساری پڑھائی پوری ہو گئی ؟"

رتنا نے بھی اسی طرح محبت آمیز لہجے میں جواب دیا " ہاں ، وہ اپنی ساری تعلیم مکمل کر کے آئے ہیں ۔

جتندر نے پوچھا " تم نے کیسے جانا ؟"

جواب میں رتنا نے صرف ٹھنڈی سانس لیکر سر ہلا دیا ۔ دراصل اس سلسلے میں وہ یا گاؤں بھا اور کوئی آدمی کچھ بھی نہ جانتا تھا ۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ اس اندازہ بالکل درست ہی ہو ۔ لیکن پھر بھی کسی طرح اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو آدمی دوسروں کے لڑکوں کو پڑھانے لکھانے کے لئے اتنی چھوٹی عمر ہی میں

اتنی زیادہ مہارت و قابلیت رکھتا ہے۔ وہ خود کسی طرح کم پڑھا لکھا نہیں۔

لیکن جنیندر نے اس بارے میں کوئی جرح نہیں کی۔ اسی دوران میں اس کے دل میں ایک اور سوال پیدا ہوا اور اس نے جھٹ سے پوچھا "کیوں بہن چھوٹے بھیا ہمارے یہاں کیوں نہیں آتے؟ بڑے بھیا تو روز آتے ہیں۔"

یہ سوال ایک اچانک تیز درد کے مانند رتنا کے تمام جسم میں بجلی کی لہر کی طرح سرایت کر گیا پھر بھی اس نے ہنس کر کہا "تم انہیں اپنے گھر بلا کر نہیں لا سکتے؟"

"تو ابھی چلا جاؤں بہن؟" کہہ کر جنیندر فوراً کھڑا ہو گیا۔

"ارے تو بھی رتنا پاگل ہی ہے" کہہ کر رتنا نے اپنے خوف سے لرزاں ہاتھ بڑھا کر اسے زور سے پکڑ لیا ——— اور یہ کہتے ہوئے پھر محبت سے اپنے سینے سے لگا لیا: خبردار جنین، کبھی ایسا کام نہ کرنا!"

جنیندر اگرچہ ابھی بچہ ہی تھا۔ پھر بھی جب اس نے صاف محسوس کیا کہ بہن کا دل دھڑک رہا ہے۔ تو وہ انتہائی حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ایک تو اس نے کبھی بہن کو ایسا کرتے دیکھا نہ تھا۔ اس پر یہ جان کر کہ چھوٹے بابو ہمارے چھوٹے بھیا ہیں۔ جب اس کے دل کی روانی کسی اور ہی طرف ہو رہی تھی۔ تو اس کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح بھی نہ آئی کہ بہن ان سے کیوں اتنا ڈرتی ہے۔

عین اسی وقت موسی کی تیز و تند آواز کانوں میں پڑتے ہی جنیندر کو چھوڑ کر رتنا جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں موسی خود آ کر دروازے پر کھڑی ہو گئی اور بولی "میں تو سمجھتی تھی کہ رتنا گھاٹ پر نہانے گئی ہے۔ آج ایکادشی ہے اس لئے اتنا دن چڑھ آنے پر بھی نہانے میں تیل نہیں پڑیگا؟ منہ سوکھ کر بالکل سیاہ ہو گیا ہے۔"

رتنا نے کچھ زور لگا کر ہنستے ہوئے کہا "موسی، تم جاؤ۔ میں ابھی جاتی ہوں"

"اور کب جاؤگی۔ باہر کر تو دیکھو، مچھلی کا حصہ تقسیم کرنے کے لئے دینی آیا ہے۔"

مچھلی کا نام سنتے ہی جنندر دلوں سے نکل گیا۔ رتا نے آنچل سے اس طرح اپنا منہ پونچھ لیا کہ موسی کو کچھ بھی پتہ نہ چلا — اور پھر وہ بھی پیچھے پیچھے چل کر باہر آ پہنچی۔ آنگن میں خوب ہنگامہ برپا تھا۔ مچھلیاں کچھ کم نہیں پکڑی گئی تھیں۔ ایک بڑا ٹوکرا بھرا ہوا تھا۔ اس کے حصے بخرے کرنے کے لئے دینی بابو خود ہی آکر حاضر ہو گئے تھے محلے کے لڑکی لڑکے ساتھ آکر چاروں طرف سے گھیر کر شور مچا رہے تھے۔

اتنے میں کسی کے کھانسنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دھم دھم لاٹھی ٹیکتے اور یہ کہتے پہنچے رشنا ہے آج بہت مچھلیاں پکڑی گئی ہیں۔"

دینی نے ناخوشی سے کہا: "زیادہ کہاں پکڑی گئی ہیں!" اور پھر مچھیرے کو بلا کر کہا۔ "اب دیر کیوں کر رہا ہے۔ جلدی سے دو حصے کر ڈال۔"

مچھیرا حصے بنانے لگا۔ اتنے میں گووند گنگولی یہ کہتے ہوئے وہاں آ پہنچے "یہ کیا ہو رہا ہے رتا۔ ادھر کئی دن سے نہیں سکا۔ سوچا کہ چل کر ذرا بیٹی کی خیر خیریت پوچھتا آؤں۔"

رتا نے مسکرا کر کہا: "آئیے!"

گنگولی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے: "ارے آج اتنی بھیڑ کیوں لگی ہے؟" اور پھر اچانک گویا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولے: "اوہ، یہ بات ہے! مچھلیاں تو کچھ کم نہیں پکڑی گئیں معلوم ہوتا ہے، بڑے تالاب میں جال ڈالا گیا تھا؟"

ان کے ان سوالات کا جواب دینا سب ہی نے فضول سمجھا اور وہ مچھلیوں کی تقسیم میں مصروف رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ کام ختم ہو گیا۔ دینی نے اپنے حصے کی تقریباً سب مچھلیاں ٹوکرے میں رکھوا کر نوکر کے سر پر رکھوا دیں اور مچھیرے کو آنکھ سے اشارہ کر کے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا۔ لیکن رتا کو تو اتنی زیادہ مچھلیوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اس کے حصے میں سے سب . . . لوگوں نے اپنی اپنی

ضرورت و قابلیت کے مطابق کھیلیاں لے لیں اور وہ بھی چلنے لگے۔ اتنے میں سب لوگوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ رتیش گھوشال کا وہی نوکر اپنے سر سے بھی اونچی لاٹھی ہاتھ میں لئے آنگن کے وسط میں آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس آدمی کا چہرہ ہی ایسا خوفناک تھا کہ سب سے پہلے اسی پر نگاہ جا پڑتی۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے سب لوگ اسے پہچان گئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں آہستہ آہستہ کئی قسم کی عجیب و غریب باتیں پھیلانی شروع کر دی تھیں۔ اتنے لوگوں کے درمیان اس نے رماہی کو کیسے مالک سمجھ کر پہچان لیا۔ یہ تو وہی جانے۔ لیکن اس نے دور ہی سے "ہاں جی!" کہکر ایک لمبا سلام کیا۔ اور قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ جیسا بھی ہو۔ آواز واقعی خوفناک۔ نہایاں بھاری اور پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے بنگلہ آمیز ہندی میں اختصار سے بتایا کہ میں رمیش بابو کا نوکر ہوں اور مچھلیوں کے تین حصوں میں سے ایک حصہ لینے آیا ہوں۔ چاہے حیرت کے باعث ہو یا اس کی درخواست کے خلاف جواب کچھ سمجھ میں نہ آنے کے باعث ہی ہو۔ تاہم اچانک اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ بھجوا نے حیرت سے گردن گھما کر دینی بابو کے نوکر سے سنگین لہجے میں کہا "اور ابھی نہ بتایا تو"

نوکر خوف کے مارے دو چار قدم ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اور دو منٹ تک کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ آخر دینی بابو نے کچھ جرأت کی۔ وہ جہاں کھڑے تھے وہیں سے بولے "کیسا حصہ"

بھجوا نے فوراً ہی انہیں بھی سلام کر کے احترام سے کہا "بابو جی! ہم نے آپ سے نہیں پوچھا"

موسی نے بہت دور دالان میں سے کہا "ارے باپ رے! تو کیا مارے

بھجوا پہلے تو تھوڑی دیر تک مرمی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس کے پھٹے گلے کی ہنسی سے سارا مکان گونج اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ہنسی روک کر اور نادم ہو کر اس نے پھر رما کی طرف دیکھ کر کہا "ماں جی!"

بھجوا کی باتوں اور برتاؤ میں انتہائی ادب و احترام کے اندر بھی گویا طنز اور رعب پوشیدہ تھا۔ یہی سوچ کر رما دل ہی دل میں چڑ گئی۔ پوچھا "تمہارے بابو کیا چاہتے ہیں؟"

رما کی ناراضگی دیکھ کر بھجوا گویا کچھ متاثر ہو گیا۔ اس لئے اس نے جہاں تک ہو سکا اپنے سخت لہجے کو نرم کر کے اپنی درخواست دہرا دی۔ لیکن اب کیا ہونا تھا؟ مچھلیوں کی تقسیم ہو چکی تھی اور وہ ٹھکانے بھی لگ چکی تھیں۔ اتنے آدمیوں کے سامنے وہ عاجزی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے تند لہجے میں کہا "تمہارے بابو کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ جا کر ان سے کہدو کہ انہیں جو کچھ کرنا ہو کریں۔"

"بہت اچھا ماں جی!" کہہ کر بھجوا نے پھر ایک لمبا سا سلام کیا۔ دہنی کے نوکر سے ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کے لئے کہہ دیا اور بغیر کچھ کہے سنے خود بھی وہاں سے چلنے لگا۔ جس وقت اس کے اس سلوک سے گھر کے سب لوگ انتہائی حیران ہو رہے تھے۔ وہ اچانک پھر لوٹ پڑا۔ اور رما کی طرف دیکھ کر اس نے اپنی ہندی اور بنگلہ ملی جلی زبان میں اپنے تیز لہجے کے لئے معافی مانگی اور کہا "ماں جی! لوگوں کی باتیں سنکر پہلے بابو جی نے مجھے تالاب پر سے مچھلیاں چھین لانے کا حکم دیا تھا۔ ہمارے بابو جی السی مچھلی چھوتے بھی نہیں اور میں بھی یہ سب کچھ نہیں کھاتا لیکن ——" اتنا کہہ کر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "بابو جی کے حکم سے آج تالاب کے کنارے ہی شاید یہ جان چلی جاتی ۔ لیکن رام جی نے بڑی خیریت کر دی کہ بابو جی کا غصہ سرد ہو گیا۔ انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ بھجوا اچا

ماں جی سے پوچھ آ کہ اس تالاب میں ہمارا بھی حصہ ہے یا نہیں!"

اس کے بعد اس نے بہت ہی احترام سے لاٹھی سمیت اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے لگائے اور رتنا کو نمسکار کرتے ہوئے کہا۔ "باپو جی نے کہہ دیا کہ بھجوا اور کوئی چاہے جو کہے۔ لیکن میں جتنی طور پر جانتا ہوں کہ ماں جی کی زبان سے کبھی جھوٹی بات نہ نکلے گی وہ کبھی پرائی چیز نہ چھوڑیں گی۔"

اتنا کہہ کر وہ دلی احترام سے بار بار نمسکار کرتا ہوا چل دیا۔

اس کے جاتے ہی رتینی نے اچھل کر عورتوں کی طرح باریک آواز سے کہا۔ "بس اسی طرح وہ اپنی دولت کی حفاظت کرے گا۔ میں تم لوگوں کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ آج سے تالاب کا ایک گھونٹ بھی اس کے ہاتھ نہ لگنے دوں گا۔ سمجھ گئیں رتنا!"

اتنا کہہ کر دینی مسرت کے مارے پھول کر ہی ہی کر کے ہنسنے لگے۔ لیکن رتنا کے کانوں میں اس کا ایک بھی لفظ داخل نہ ہوا۔ بار بار اس کے کانوں میں بھجوا کے یہ الفاظ لاکھوں تالیوں کی تڑ تڑاہٹ کے مانند گونج رہے تھے۔ کہ ماں جی کی زبان سے کبھی جھوٹی بات نہ نکلے گی۔ اس کا گورا گورا چہرہ لمحہ بھر کے لئے سرخ ہو کر اس کے بعد فوراً اتنا سفید ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں کہیں ایک بوند بھی خون نہیں۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے اس نے اپنے سر کا آنچل کچھ اور آگے کھینچ لیا اور جلدی سے وہاں سے چلی گئی۔

---

(۸)

"تائی جی"!

"کون؟ رمیش! آؤ بیٹا اندر چلے آؤ"

وشنو لیشوری نے جلدی سے ایک چٹائی بچھادی۔ گھر میں پیر رکھتے ہی رمیش چونک پڑے۔ کیونکہ تائی جی کے پاس جو عورت بیٹھی تھی۔ اس کا منہ اگرچہ نہیں دکھائی نہ دیا۔ تاہم انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ تارہ ہے۔ وہ جل اٹھے۔ کہ یہ لوگ مجھ کو بیچ میں ڈال کر تذلیل و تحقیر کرنے میں بھی کمی نہیں کرتے اور اس طرح بے شرموں کی طرح تنہائی میں پاس آکر بھی بیٹھتے ہیں۔ ادھر رمیش کے اچانک آجانے سے تارا بھی کچھ معمولی تکلیف میں نہیں پڑی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اس گاؤں کی لڑکی تھی۔ لیکن رمیش کے ساتھ اس کا رشتہ ہی کچھ اس قسم کا تھا کہ بالکل اجنبیوں کی طرح گھونگھٹ نکالنے میں بھی اسے شرم محسوس ہوتی تھی اور گھونگھٹ کے بغیر بھی وہ چین نہ پاتی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی اس دن مچھلیوں کے بارے میں جھگڑا ہو گیا تھا! اس لئے سب باتوں کا بچاؤ کرتے کرتے جہاں تک ہو سکتا تھا۔ وہ ذرا سے منہ پھیر کر بیٹھی تھی رمیش نے پھر اس کی طرف نہیں دیکھا اور کوٹھڑی میں اور بھی کوئی ہے۔ اس کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوئے آرام سے چٹائی پر بیٹھ گئے کہا "تائی جی"! تائی جی نے کہا "کیوں رمیش! اچانک اس دوپہر کے وقت کیسے آگئے"

رمیش نے کہا "اگر دوپہر کو نہ آؤں تو پھر اور کسی وقت تمہارے پاس بیٹھنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا تمہیں کام بھی تو کم نہیں رہتے!"

تائی جی اس بات کا جواب دینے کی بجائے صرف ذرا ہنس کر رہ گئیں۔ رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت دن ہوئے جب میں بہت چھوٹا تھا تو ایکبار آکر تم

سے رخصت ہو کر چلا گیا تھا۔ آج پھر اُسی طرح رخصت ہونے آیا ہوں۔ اور تائی جی یہ شاید میری آخری رخصت ہو۔"

اگرچہ رتیش کے منہ پر کچھ مسکراہٹ تھی۔ پھر بھی ان کے لہجے سے ان کے غمزدہ دل کے ایک ایسے گہرے سوز درد کا اظہار ہوا کہ دونوں ہی سننے والیاں حیرت اور غم سے چونک اٹھیں۔

"تم جُگ جُگ جیو بیٹا۔ یہ کیسی بات کہہ رہے ہو!" کہتے کہتے وسنتو لیتوری کی دونوں آنکھیں چھلک آئیں۔ رتیش صرف مسکرا کر رہ گئے۔ وسنتو لیتوری نے محبت آمیز لہجے میں پوچھا "کیوں بیٹا! کیا یہاں صحت اچھی نہیں رہتی؟"

رتیش نے اپنے تنومند اور مضبوط جسم کی طرف ایک دو بار دیکھ کر کہا "تائی جی یہ محنتی، دال روٹی کا پلا ہوا جسم ہے بھلا یہ کیا اتنی جلد خراب ہو سکتا ہے؟ نہیں صحت تو بالکل اچھی ہے۔ لیکن اب یہاں مجھ سے ایک لحظہ بھی نہیں رہا جاتا۔ رہ رہ کر میرا دم سا گھٹنے لگتا ہے۔"

جب وسنتو لیتوری کو یہ معلوم ہو گیا کہ صحت اچھی ہے۔ طبیعت خراب نہیں تو انہوں نے اطمینان کی سانس لے کر ہنستے ہوئے کہا "یہ تو تمہاری جنم بھومی ہے۔ تمہارا گھر ہے پھر یہاں تم سے کیوں نہیں رہا جاتا؟"

رتیش نے سر ہلا کر کہا "یہ میں نہیں کہنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ضرور سب کچھ جانتی ہو۔"

وسنتو لیتوری نے تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد متانت اختیار کر کے کہا "سب نہیں، تاہم بہت کچھ جانتی ہوں۔ لیکن رتیش اسی لئے تو کہتی ہوں کہ اور کہیں جانے سے تمہارا کام نہ چلے گا۔"

رتیش نے کہا "کیوں تائی جی۔ کیوں نہ چلے گا؟ یہاں مجھے کوئی بھی تو نہیں

چاہتا۔"

"تائی جی نے کہا۔ "کوئی چاہتا نہیں بیٹا اسی لئے تو میں تمہیں کہیں بھاگنے نہ دوں گی ابھی جو تم اپنے وال روٹی پر پلے ہوئے جسم کی بڑھائی کر رہے تھے۔ وہ کیا یہاں سے بھاگ جانے کے لئے ہے؟"

رمیش خاموش رہے۔ آج کیوں ان کا تمام دل اس گاؤں کے خلاف نفرت اور غم و غصہ کی آگ سے جل رہا تھا؟ اس کی ایک خاص وجہ تھی گاؤں سے جو راستہ سیدھا اسٹیشن کو جاتا تھا۔ وہ آٹھ دس برس پہلے ایک جگہ برساتی پانی کے بہاؤ سے ٹوٹ گیا تھا۔ جب سے وہ گڑھا آہستہ آہستہ اور بھی بڑا اور گہرا ہوتا گیا۔ وہاں اکثر پانی جمع ہو جاتا اور اسے پار کرنے میں سب لوگوں کو بڑی دقت اٹھانا پڑتی۔ اتی دنوں میں تو کسی طرح سنبھال سنبھال کر پاؤں رکھتے ہوئے۔ بڑی احتیاط سے لوگ گزر بھی جاتے۔ لیکن برسات میں تو تکلیف کی حد نہ رہتی۔ کسی کسی سال دو چار بانس ڈال کر اور کسی کسی سال تاڑ کا ایک آدھ لنگڑا لولا تنا اوندھا ڈال کر لوگ اس کی امداد سے جیسے تیسے گرتے پڑتے اور اللہ پیر ٹوٹتے بچتے اس پار پہنچا کرتے لیکن اتنی زیادہ تکلیف ہونے پر بھی آج تک گاؤں والوں نے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش نہ کی۔ مرمت کرنے میں کچھ روپیہ پیسہ خرچ ہوتا۔ یہ روپیہ رمیش نے اپنے پاس سے دینے کے بجائے چندہ کرنے کی کوشش کی سال اس کے لئے آٹھ دس روز تک دوڑ دھوپ بھی کی۔ لیکن وہ کسی سے آٹھ دس پیسے بھی وصول نہ کر سکے۔ صرف یہی نہیں۔ آج صبح جب وہ چہل قدمی کر کے واپس آرہے تھے۔ تو راستے میں ایک جگہ سنار کی دکان کے اندر کچھ آدمیوں کو اسی موضوع پر باتیں کرتے دیکھا۔ باہر کھڑے ہو کر سننے پر معلوم ہوا کہ ایک آدمی کسی دوسرے سے ہنس ہنس کر کہہ رہا ہے "تم لوگ ایک پیسہ بھی نہ دینا دیکھتے نہیں کہ انہیں خود ہی مرمت کی سب سے زیادہ غرض ہے۔ اگر تم لوگ

نہیں دو گے تو دیکھ لینا۔ وہ خود ہی اپنے پاس سے مرمت کرا دینگے۔ انہیں جوتا چھپاتے ہوئے چلتا ہے نا! اللہ پھر جب وہ اتنے دنوں تک یہاں نہ تھے۔ تو کیا ہم لوگوں کا سٹیشن آنا جانا بند تھا؟" اس پر ایک ادا دمی نے کہا" ارے صبر کرو۔ بھائی! چیئرجی کہہ رہے تھے۔ کہ رتیش کی پیٹھ پر ذرا سا ہاتھ پھیر کر ان سے سستا ہی کام ٹھیک کرا لیا جائیگا۔ بس وہاں ذرا سی ان کی خوشامد کی اللہ انہیں بابو۔ بابو کہا بس سب کام بن گیا۔"

یہی دونوں باتیں آج صبح سے رتیش کو آگ کی طرح جلا رہی تھیں۔ تائی جی نے بھی ٹھیک اسی جگہ چوٹ پہنچائی۔ انہوں نے پوچھا" تم جو وہ سڑک ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ اس کا کیا ہوا؟"

رتیش نے چڑ کر کہا" اب وہ سڑک ٹھیک نہ ہوگی۔ کوئی ایک پیسہ بھی چندہ نہ دیگا۔"

وشو لیشوری نے ہنس کر کہا" نہیں دیگا۔ کہہ دینے سے کیسے کام چلے گا؟ تمہیں اپنے بابو جی سے بہت سے روپے ملے ہیں۔ بیٹا۔ یہ تھوڑے سے روپے تو تم خود بھی دے سکتے ہو۔"

رتیش نے ایک دم آگ بگولا ہو کر کہا" میں کیوں دینے لگا؟ مجھے تو اسی بات کا بہت زیادہ دکھ ہو رہا ہے۔ کہ میں نے بہت سے روپے بغیر سمجھے بوجھے ان لوگوں کے سکول کے لئے کیوں خرچ کر ڈالے۔ اس گاؤں کے کسی آدمی کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا چاہیئے۔"

پھر ایک بار رما کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ کر کہا" ان لوگوں کو اگر دان دیا جائے تو یہ دینے والے کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی بھلائی کرے تو یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی غرض سے کرتا ہے۔ انہیں تو معاف کرنا۔

بھی مہا پاپ (گناہِ عظیم) ہے۔ سوچتے ہیں کہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔"

تائی جی قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں، لیکن رنا کی آنکھیں اور چہرہ ایکدم سیاہ پڑ گیا۔
رتیش نے ناراض ہو کر پوچھا: "کیوں تائی جی۔ تم ہنسیں کیوں؟"

تائی جی نے کہا: "ہنسوں نہ اور کیا کروں بیٹا؟" پھر ایک ٹھنڈی سانس لیکر بولیں
"لیکن میں تو کہوں گی کہ یہیں تمہارے رہنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ رتیش!
اگر تم ناراض ہو کر اپنی جنم بھومی چھوڑ کر چلے جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں سے پوچھتی ہوں
کہ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ تم ان پر ناراض ہو؟" پھر قدرے ٹھہر کر وہ گویا آپ
ہی آپ کہنے لگیں: "رتیش اگر تم جانتے ہوتے کہ یہ لوگ کتنے غریب اور کتنے کمزور
ہیں تو ان پر غصہ کرتے تمہیں خود ہی شرم محسوس ہوتی۔ بھیا، جب بھگوان نے کرم
کر کے تمہیں یہاں بھیجا ہے تو تم انہیں لوگوں میں رہو۔"

رتیش نے کہا: "تائی جی یہ لوگ مجھے چاہتے جو نہیں!"

تائی جی نے کہا: "تو اتنے ہی سے کیا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ تمہارے
غصہ کرنے اور روٹھنے کے کتنے ناقابل ہیں؟ اور پھر صرف یہیں کیوں تم جس
گاؤں میں گھوم آؤ، سب جگہ ایک ہی سا حال دیکھو گے۔" اس کے بعد انہوں
نے اچانک رنا کی طرف دیکھ کر کہا: "اور کیوں بیٹی! تم جب ہی سے اس طرح
سر جھکائے کیوں بیٹھی ہو؟ ——— کیوں رتیش، تم دونوں بھائی بہن میں کیا بات
چیت نہیں ہوتی؟ ——— بیٹی ایسا نہ کرو۔ اس کے باپ کے ساتھ تم لوگوں کا جو
لڑائی جھگڑا تھا ۔ وہ ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ۔ اب اگر اب تم لوگ آپس میں
ناراضگی رکھو گے تو کام نہ چلے گا۔"

رنا نے سر نیچا کئے آہستہ سے کہا: "تائی جی، میں تو کچھ بھی ناراضگی نہیں رکھنا
چاہتی۔ رتیش بھیا ——— اچانک رنا کی نرم و نازک آواز رتیش کی عقیدت د

بلند آواز سے رب عتی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے "تائی جی، تم اس معاملے میں نہ پڑو۔ اس دن ان کی موسی کے ہاتھوں سے بڑی مشکل سے جان بچی تھی۔ آج نہیں یہ پھر جا کر انہیں سمجھا دیں تو وہ آ کر ہمیں چبا کھائے بغیر گھر نہ لوٹیں گی۔"

اس کے بعد بغیر کسی تکرار اور جرح و قدح کے وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔ وشویشوری نے پکار کر کہا "جاؤ نہیں رمیش ذرا بات سنتے جاؤ۔"

رمیش نے دروازے کے باہر ہی سے کہا "نہیں تائی جی، جو لوگ غرور و تکبر کے مارے تمہیں بھی پاؤں تلے روندتے جاتے ہیں۔ ان کی طرف سے تم کچھ بھی نہ کہو۔"

اتنا کہہ کر وشویشوری کے دوبارہ اصرار کرنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلے گئے۔ رما مضطرب و بے قرار کچھ دیر تک وشویشوری کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر رو پڑی۔ اس نے کہا "تائی جی، آخر یہ کلنک مجھ پر کیوں مڑھا جا رہا ہے؟ کیا میں موسی کو سکھا دیتی ہوں یا ان کی باتوں کے لئے میں ذمہ دار ہوں؟"

تائی جی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور محبت سے اپنے پاس کھینچ کر کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ تم سکھا نہیں دیتی ہو۔ لیکن بیٹی موسی کی باتوں کے لئے تمہیں کچھ ذمہ دار تو ہونا ہی ہوگا۔"

رما نے دوسرے ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھتے پونچھتے تائی جی سے اختلاف کرتے ہوئے کہا "میں کیوں ذمہ دار ہونے لگی؟ کبھی نہیں۔ تائی جی، میں تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ تو پھر وہ کیوں مجھ پر جھوٹا الزام لگا کر میری بے عزتی کر گئے ہیں؟"

وشویشوری نے اس معاملے پر اور بحث مباحثہ نہیں کیا۔ آہستہ سے

کہا: "بیٹی، سب لوگ دل کا حال تو جان نہیں سکتے۔ لیکن یہ بات میں تمہیں یقین سے بتا سکتی ہوں کہ تمہاری بے عزتی کرنے کی خواہش اسے کبھی نہیں ہو سکتی۔ تم تو جانتی نہیں بیٹی! لیکن گوپال سرکار کے منہ سے مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ تم پر کتنی زیادہ عقیدت اور اعتبار و اعتماد رکھتا ہے۔ اس دن اپنی ماں کا پیڑ کٹوا کر جب تم دونوں نے آپس میں بانٹ لیا تو اس نے کسی کے بھی کہنے پر دھیان نہیں دیا کہ اس میں اس کا بھی حصہ تھا۔ سب لوگوں کے سامنے اس نے ہنس کر کہہ دیا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب رما موجود ہے تو میرا جیب حصہ مجھے ضرور مل جائیگا۔ وہ کبھی پرائی چیز ہضم نہ کرے گی۔ بیٹی! میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ اتنے لڑائی جھگڑے کے بعد بھی تم پر اس کا پہلے ہی طرح اعتماد بنا ہوا ہے۔ اگر اس دن تالاب کی مچھلیاں ــــــ اتنا کہہ کر وشوشوری اچانک رک گئیں اور انہوں نے تھوڑی دیر تک ٹکٹکی لگا کر رما کے سر کٹے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا ــــــ بیٹی رما! آج میں تم سے ایک بات کہتی ہوں۔ زمین جائداد کی حفاظت کی ضرورت چاہے کتنی زیادہ کیوں نہ ہو۔ لیکن رعیت کی جان کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے کسی کی باتوں میں آکر کسی بھی چیز کے لالچ میں پھنس کر چاروں طرف سے چوٹ پہنچا پہنچا کر بیٹی اسے ضائع نہ کر ڈالنا۔ میں تم سے یقینی طور پر کہتی ہوں کہ اس سے ملک کا جتنا نقصان ہوگا۔ اس کی پھر اور کسی طرف سے تکمیل نہ ہو سکیگی۔"

رما چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس نے ایک بھی بات کا جواب نہ دیا۔ وشوشوری بھی خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد رما نے نازک لہجہ میں کہا: "تائی جی، بہت دیر ہو گئی۔ اب میں گھر جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر تائی جی کو پرنام کر کے وہ وہاں سے چلی گئی۔

تائی جی کے گھر سے رمیش خواہ کتنا ہی ناراض ہو کر کیوں نہ چلے آئے ہوں، لیکن گھر پہنچتے پہنچتے ان کا تمام غصہ کافور ہو گیا۔ وہ رہ رہ کر اپنے دل میں سوچنے لگے۔ یہ سیدھی سی بات نہ سمجھنے کے باعث میں کتنی تکلیف اٹھا رہا تھا۔ حقیقت میں غصہ کس پر کروں؟ جو اتنی زیادہ غربت کے باعث خود غرضی پر مجبور ہیں۔ کہ آنکھیں کھول کر یہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ کہ ہماری حقیقی بہتری کس بات میں ہے یا تعلیم کی کمی کے باعث اتنے اندھے ہیں کہ اپنے پڑوسیوں کی طاقت برباد کرنے ہی کو اپنی طاقت کے استعمال کا صحیح طریقہ سمجھتے ہیں۔ بھلائی کرتے دیکھ کر شک و شبہ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان لوگوں پر غصہ کرنے یا چڑھنے سے کیا حاصل؟ انہیں یاد آیا کہ دیہات سے بہت دور شہر میں رہ کر کتابیں پڑھ کر لوگوں سے سُن کر اور تصورات قائم کر کے میں نے نہ جانے کتنی بار سوچا ہے کہ ہماری بنگالی جاتی کے پاس چاہے اور کچھ بھی نہ ہو، لیکن ہنگاموں سے دور تنہائی میں آباد گاؤں کا وہ سکون اور پاکیزگی تو ہے۔ جو ہنگامہ پرور شہر میں نہیں۔ بہت سے تھوڑے میں مطمئن رہنے والے یہ گاؤں کے باشندے ہمدردی سے پگھل جاتے ہیں۔ ایک آدمی پر مصیبت آتی ہے۔ تو دوسرا اس کے سامنے سینہ تان دیتا ہے۔ اور اگر ایک آدمی راحت و آرام میں ہوتا ہے۔ تو دوسرا اس کے بیاہ شادی بلائے ہی جا کر خوشیاں منانے لگتا ہے۔ صرف دیہات اور انہیں سب دیہاتیوں میں صحیح شان و عظمت موجود ہے۔ لیکن آہ۔ یہ میری کتنی بڑی غلط فہمی تھی۔ آپس میں اتنی بنیادی رنجشیں اور مخالفتیں اور دوسرے سے حسد کا اتنا زیادہ جذبہ تو مجھے شہر میں بھی دکھائی نہیں دیا۔ آج اس بات کو یاد کر کے گویا رمیش کے جسم پر سبز اور سانپ رینگتے محسوس ہونے لگے۔ جب بھی کبھی انہوں نے

شہریت کے دامن پر گناہ کا داغ دیکھا تو انہوں نے یہی سوچا کہ اگر میں کسی طرح اپنی جنم بھومی والے چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ جاؤں تو یہ سب مناظر دیکھنے سے ہمیشہ کے لئے بچ جاؤں۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہاں دنیا میں جو سب سے بڑا ہے، وہ دھرم ہے ——— اور شوشل کردار بھی آج دہیں مجسم ہو کر پراجمان ہے لیکن اسے بھگوان کہاں ہے وہ کردار؟ اور کہاں ہے وہ جیتا جاگتا دھرم ہمارے اس قدیم گاؤں میں؟ اور اگر تم نے دھرم کی روح ہی سلب کر لی ہے۔ تو پھر اس کی بےجان لاش کیوں اس طرح ڈال رکھی ہے؟ دھرم کے اسی بگڑے اور سڑے ہوئے لاشے کو اس بدقسمت دیہاتی سماج نے حقیقی دھرم سمجھ کر مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ اور اسی کی رہبرانہ ہوا دار پر ادار پھسلن پر دن رات پھسلتا ہوا یہ تنزل کی طرف بڑھتا جا رہا ہے اور سب سے زیادہ دل پر چوٹ پہنچانے والی ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ شہریوں کے متعلق بد لوگ یہ سمجھ کر دل میں حد سے زیادہ نفرت اور بدگمانی کا جذبہ رکھتے ہیں کہ ان میں دھرم باقی نہیں رہا!

رمیش نے اپنے گھر کے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا کہ صحن میں ایک طرف جو ایک ادھیڑ عمر عورت گیارہ بارہ برس کے ایک لڑکے کے ساتھ سکڑی ہوئی بیٹھی تھی، وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بغیر کوئی بات جانے صرف اس لڑکے کا چہرہ دیکھ کر ہی رمیش کے دل سے گریہ کے بادل اٹھنے لگے۔ گوپال سرکار چنڈی منڈپ والے برآمدے میں بیٹھے کچھ لکھ پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا "یہ دکشن پاڑے (محلے کا نام) کے دوار کا پنڈت کا لڑکا ہے۔ آپ کے پاس کچھ بھیک مانگنے آیا ہے۔"

بھیک کا نام سنتے ہی رمیش نے جل کر کہا "کیا میں صرف بھیک دینے کے لئے ہی گھر آیا ہوں! کیا گاؤں میں اور لوگ نہیں؟"

گوپال سرکار نے کچھ حیران ہو کر کہا "ہاں بابو جی! یہ بات تو ٹھیک ہے۔

لیکن تیرے باپو جی کے وقت یہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا تھا۔ اسی لیے
سب ناچاری کی حالت میں یہاں دوڑے آتے ہیں؟" پھر لڑکے کی طرف دیکھ کر
اس ادھیڑ عورت سے کہا "کامنی کی ماں۔ ان لوگوں کا قصور بھی تو کچھ کم نہیں جب
بیٹا تھا تو ان لوگوں نے اس کا پرائشچت نہیں کرایا اور اب جب وہ مردہ نہیں
رہا ہے تو مدد پانے کے لیے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ کیا ان کے گھر میں تھالی، لوٹا
تک نہیں؟"

کامنی کی ماں ذات کی سدگوپ تھی اور اس لڑکے کی پڑوسن۔ اس نے سر ہلا کر
"بھیا۔ یقین نہ ہو تو خود چل کر دیکھو۔ اگر گھر میں کچھ بھی ہوتا تو کیا میں اس کے
باپ کو گھر میں چھوڑ کر اسے بھیک مانگنے کے لیے لاتی! تم نے آنکھوں سے
دیکھا۔ مگر سنا تو سب ہے! میرے پاس جو کچھ بھی تھا۔ ان چھ مہینوں میں
ان لوگوں کے لیے خرچ کر ڈالا ہے۔ سوچتی تھی کہ کہیں پڑوس میں برہمن کے بچے
کے بغیر بھوکے نہ مر جائیں!"

اب گویا رمیش اس معاملے میں بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکے۔ گوپال سرکار
جانتے ہوئے کہا "اس لڑکے کے باپ دینا چکرورتی چھ مہینے سے دمے کی
بیماری کے مارے چارپائی پر پڑے تھے۔ آج صبح وہ مر گئے۔ ان کا پرائشچت
نہیں ہوا تھا۔ اس لیے کوئی ان کی لاش نہیں چھونا چاہتا۔ اس وقت پرائشچت کرنا
ضروری ہے۔ کامنی کی ماں چھ مہینے سے اس غریب برہمن خاندان کی امداد کرتی آ
رہی ہے اور اسی میں وہ اپنا سب کچھ لٹا چکی ہے۔ اب اس کے پاس بھی کچھ نہیں
اسی لیے وہ اس لڑکے کو لے کر آپ کے پاس آئی ہے۔"

رمیش نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پوچھا "اب تو وہ بیچ رہے ہیں
پرائشچت نہ ہو تو کیا مردہ پڑا ہی رہے گا؟"

* بعض دمہ وغیرہ کئی امراض کے بیماروں کو پرائشچت کرنے کا رواج ہے۔ (مترجم)

سرکار نے ہنس کر کہا "بابو جی اور چارہ ہی کیا ہے۔ شاستر کے خلاف تو کام ہو ہی نہیں سکتا اور پھر اس میں گاؤں کے لوگوں ہی کو الزام دیا جا سکتا ہے۔ جو بھی ہو مردہ پڑا نہیں رہیگا۔ جس طرح ہو سکے ان لوگوں کو کام کرنا ہی پڑیگا۔ اسی لئے تو جب تک — ہاں کامنی کی ماں اور کہیں بھی گئی تھیں ؟"

لڑکے نے مٹھی کھول کر ایک چونی اور چار پیسے دکھا دیئے۔ کامنی کی ماں نے کہا "چونی تو نگر جی کے یہاں سے ملی ہے۔ اور چار پیسے ہالدار نے دیئے ہیں لیکن تو چونیوں سے کم تو کام میں ہی نہیں سکتا۔ اس لئے بابو جی اگر —"

رمیش نے جلدی سے کہا "اچھا، تم لوگ گھر جاؤ۔ اب اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے میں ابھی سب انتظام کر کے آدمی بھیجتا ہوں۔"

ان لوگوں کو رخصت کر کے رمیش نے گوپال سرکار کے منہ کی طرف بہت ہی مضطرب نگاہ سے دیکھ کر پوچھا "آپ جانتے ہیں کہ اس گاؤں میں اس طرح کے اور کتنے غریب گھر ہیں ؟"

گوپال نے کہا "دو ہی تین گھر ہیں، زیادہ نہیں۔ ان لوگوں کے یہاں بھی کھانے پہننے کی کمی نہ تھی۔ لیکن ایک پیڑ کے معاملے میں دوارکا چکرورتی اور سانن ناجرا میں خوب مقدمہ بازی ہوئی۔ جس میں پانچ برس ہوئے، دونوں ہی گھر تباہ ہو گئے۔" اس کے بعد انہوں نے آواز نرم کر کے کہا "بابو جی، یہاں تک نوبت نہ آتی۔ لیکن ہمارے بڑے بابو اور گووند گنگولی نے دونوں آدمیوں کو شہہ دے دیکر یہ حالت کرا دی۔"

رمیش نے کہا "اس کے بعد ہمارے بڑے بابو کے یہاں ہی دونوں آدمیوں کے پاس جو کچھ تھا، سب رہن ہو گیا۔ ابھی پر سال انہوں نے اصل اور سود سب ملا کر ان کا جو کچھ تھا، سب خرید لیا۔ لیکن آفرین ہے اس بیچاری کامنی کو

اس نے ایسی مصیبت کے وقت اس برہمن کی جو امداد کی وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔"

رتیش ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے گوپال سرکار کو وہاں کا سب بندوبست کرنے بھیج دیا اور دل ہی دل میں کہا —— "تائی جی آپ کا حکم ہی میں بسر و چشم بجا لاتا ہوں۔ اگر یہاں مر بھی جاؤں تو اچھا۔ لیکن اس بدقسمت گاؤں کو چھوڑ کر اب کہیں نہیں جاؤں گا۔"

(۱۰)

تقریباً تین ماہ بعد ایک دن صبح کے وقت تارکیشوری کے اس تالاب کی سیڑھیوں پر جسے لوگ دودھ ساگر کہتے ہیں رتیش کا ایک عورت سے آمنا سامنا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ایسے مبہوت سے رہ گئے۔ اور اس کے کھلے چہرے کی طرف ایسے غیر مہذبانہ طریق سے ٹکٹکی باندھ کر کھڑے دیکھتے رہے کہ انہیں یہ خیال ہی نہ رہا کہ مجھے راستہ چھوڑ کر ہٹ جانا چاہیئے۔ اس عورت کی عمر غالباً بیس برس سے زیادہ نہ ہو گی۔ وہ اشنان کر کے اوپر آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ کا پانی سے بھرا ہوا گھڑا زمین پر رکھ کر گیلی دھوتی کے نیچے دونوں بازو چھاتی کے اوپر سمیٹ کر سر جھکا کر نرم و نازک آواز سے پوچھا "آپ یہاں کیسے؟" رتیش کی حیرت کی حد نہ رہی لیکن ان کا اضطراب اب دور ہو گیا۔ ایک طرف ہٹ کر انہوں نے پوچھا "کیا آپ مجھے پہچانتی ہیں؟"

اس عورت نے کہا "ہاں پہچانتی ہوں۔ آپ یہاں کب آئے؟"

رتیش نے کہا "آج ہی صبح۔ میرے ماموں کے گھر سے عورتوں کے آنے کی بات تھی۔ لیکن وہ آئیں نہیں۔"

عورت نے پوچھا "یہاں کہاں ٹھہرے ہیں؟"

رمیش نے کہا "کہیں نہیں۔ میں پہلے کبھی یہاں نہیں آیا۔ لیکن آج ایک دن تو جیسے بھی ہو ان کے انتظار میں کہیں رہنا ہی پڑیگا۔ اور اس کے لئے کہیں نہ کہیں جگہ ڈھونڈھ ہی لونگا۔"

"نوکر تو ساتھ ہے نہ؟"

"نہیں۔ میں اکیلا ہی ہوں۔"

"اچھی بات ہے" یہ کہکر جیسے ہی اس عورت نے ہنس کر سر اٹھایا۔ پھر دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ لیکن اس عورت نے پھر آنکھیں جھکا لیں اور دل ہی دل میں کچھ ادھر اُدھر کرکے آخر کہا "اچھا تو پھر آپ میرے ساتھ آیئے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا گھڑا اٹھا لیا۔ اور چلنے کو تیار ہو گئی۔ رمیش سنش و پنج میں پڑگئے بولے "میں چل تو سکتا ہوں کیونکہ اگر اس میں ہرج ہوتا تو آپ مجھے چلنے کے لئے ہی نہ کہتیں۔ اور یہ بات بھی نہیں کہ میں آپ کو پہچانتا نہ ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے یاد نہیں آتا کہ آپ کون ہیں۔ آپ اپنا تعارف کرا دیجئے۔"

"اچھا تو آپ تھوڑی دیر یہیں ٹھہریں۔ میں پوجا کر لوں۔ راستے میں چلتے چلتے اپنا تعارف کراؤں گی۔"

یہ کہہ کر وہ مندر کی طرف چلی گئی۔ رمیش مبہوت کی طرح اسے دیکھتے رہ گئے وہ سوچنے لگے کہ کیسا عجیب دربہار حسن و شباب اس کی لال اودھوتی کو چھید کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ جسمانی تزئین، اور رفتار کا انداز سب کچھ رمیش کے لئے جانا پہچانا تھا۔ لیکن ان کی یاد کے جو کواڑ اودھر بہت دنوں سے بند تھے۔ وہ کسی طرح کھلتے ہی نہ تھے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد جب وہ پوجا کر کے باہر آئی۔ تو رمیش نے پھر ایک بار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لیکن اب بھی وہ پہلے ہی کی

طرح تعارف کی حدود سے باہر ہے۔ راستے میں چلتے وقت رمیش نے پوچھا "کیا
آپ کے ساتھ آپ کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے؟"

عورت نے جواب دیا "نہیں۔ داسی ہے۔ وہ گھر پر کام کر رہی ہے۔ میں اکثر یہاں
آیا کرتی ہوں یہاں کا سب کچھ میرا جانا پہچانا ہے۔"

رمیش نے پوچھا "لیکن آپ مجھے اپنے ساتھ کہاں لئے جا رہی ہیں؟"

کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہنے کے بعد اس نے کہا "اس لئے کہ آپ کو کھانے پینے
کی بہت تکلیف ہوگی۔ میں تارا ہوں"

تارا نے سامنے بیٹھ کر رمیش کو کھانا کھلایا۔ پھر ان کے آرام کے لئے اپنے ہاتھ سے
ایک دری بچھا کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رمیش اس دری پر آنکھیں بند
کر کے لیٹ گئے۔ انہیں خیال آیا کہ میری پچیس برس کی زندگی اس ایک ہی لمحے میں
یکدم بدل گئی ہے۔ لڑکپن سے اب تک کی تمام زندگی انہوں نے پردیس میں دوسرے
کے سہارے گزاری تھی۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ کھانے پینے کے سوا بھوک مٹانے کی
اور بھی کوئی بات کسی بھی حالت میں ہو سکتی ہے۔ اسی لئے آج کی اس اچانک تسکین
سے ان کا دل حیرت اور شکر گزاری میں ڈوب گیا۔ تارا یہاں ان کے کھانے پینے کے
لئے کچھ بھی فراہم نہ کر سکی تھی۔ بہت ہی معمولی چیزیں اس نے ان کے سامنے رکھی تھیں
اس لئے اسے بڑی فکر تھی کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا پیٹ نہ بھرے اور غیر کے سامنے
میری بے عزتی ہو۔ یہ پیٹ نہ بھرنے کی فکر اس کی کتنی خود ساختہ تھی۔ آج شرم و حیا
کی رکاوٹ اسے رمیش سے دور نہ رکھ سکی۔ کھانے کی یہ تخیلی کمی صرف کوشش
ہی سے پوری کرنے کے لئے وہ ان کے سامنے جا کر بیٹھی۔ کھانے کے بخیر و خوبی
ختم ہو جانے پر گہری تسکین کا جو سانس تارا کے سینے کی گہرائیوں سے نکلا۔

وہ خود رتمیش کے سانس سے ننھا بڑھ کر تھا۔ یہ بات خواہ اور کسی کو معلوم نہ ہوئی ہو۔ لیکن جو سب کچھ جانتا ہے جو عالم الغیب ہے اس سے تو چھپی نہ رہی۔

رتمیش کو دن کے وقت سونے کی عادت نہ تھی۔ ان کے سامنے جو چھوٹی سی کھڑکی تھی اس کے باہر اودے اودے بادل دوپہر کے آسمان پر پھیل گئے تھے۔ نیم وا آنکھوں سے وہ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی چور رشتہ دار عورتیں آنے والی تھیں۔ ان کے آنے یا نہ آنے کا انہیں اس وقت خیال ہی نہ تھا۔ اچانک رتا کی نرم و نازک آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ وہ دروازے کے باہر کھڑی ہو کر کہہ رہی تھی

"آج جب آپ گھر نہیں جاتا تو پھر یہیں کیوں نہ رہیں؟"

رتمیش جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور بولے "لیکن جن کا یہ مکان ہے۔ انہیں تو ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ جب تک وہ نہ کہیں میں کیسے رہ سکتا ہوں؟"

رتا نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا "رہنے ٹھہرنے کے لئے کہتے ہیں۔ یہ مکان میرا ہی ہے۔"

رتمیش نے حیران ہو کر پوچھا "یہاں مکان کیوں لے رکھا ہے؟"

"یہ جگہ مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔" رتا نے کہا "میں اکثر آیا کرتی ہوں۔ اگرچہ آج کل یہاں کوئی نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی یہاں پاؤں پھیلانے کی بھی جگہ نہیں رہ جاتی۔"

رتمیش نے کہا "تو ایسے وقت نہ آیا کرو۔"

رتا مسکرا کر خاموش رہ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ نارک ناتھ بابا پر تمہاری بڑی بھگتی ہے۔ ان سے تم بڑی عقیدت رکھتی ہو ہے نہ؟"

"بھلا مجھ سے ایسی بھگتی کہاں ہو سکتی ہے! لیکن جب تک زندگی ہے کوشش

توکرنی چاہئیے۔"

رتمیش نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ رتنا وہیں چوکھٹ سے لگ کر بیٹھ گئی اور دوسری بات چھیڑ دی۔ "اچھا ، رات کو آپ کیا کھاتے ہیں؟"

رتمیش نے ہنستے ہوئے جواب دیا: "جو کچھ مل جاتا ہے۔ کھا لیتا ہوں۔ کھانے پر بیٹھنے سے لے کر پہلے تک بھی کھانے کے بارے میں کوئی خیال نہیں کرتا۔ اپنے باورچی کی ہوشیاری اور سمجھ پر ہی مجھے مطمئن رہنا پڑتا ہے۔"

رتنا نے پوچھا: "آخر اتنی بے پروائی اور بے دلی کیوں؟"

رتمیش کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس میں چھپی ہوئی طنز ہے یا رتنا نے فطری ہنسی مذاق سے کہا ہے۔ انہوں نے اختصار سے کہا: "نہیں۔ یہ صرف کاہلی ہے۔"

رتنا نے کہا: "لیکن دوسروں کے کام میں تو آپ کو کبھی کاہلی سے کام لیتے نہیں دیکھتی۔"

رتمیش نے کہا: "اس کی وجہ ہے! دوسروں کے کام میں سستی کی جائے تو اس کے لئے نگران کے سامنے جواب دینا پڑتا ہے۔ ہو سکتا ہے اپنے کام میں بھی جوابدہی لازمی ہو، لیکن یقیناً اتنی نہ ہوگی۔"

رتنا نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا: "آپ کے پاس روپیہ ہے۔ اسی لئے آپ دوسروں کے کاموں میں دل لگا سکتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پاس نہیں؟"

رتمیش نے کہا: "رتنا میں ان لوگوں کی بات نہیں جانتا کیونکہ روپے ہونے کی بھی کوئی دلیل نہیں۔ اور دل لگانے کا بھی کوئی مقررہ ناپ تول نہیں۔ روپے ہونے نہ ہونے کا حساب بھی وہی جانتے ہیں۔ جنہوں نے اس دنیا اور پرلوک دونوں جہاں کا بوجھ لے رکھا ہے۔"

رتنا نے پھر تھوڑے خاموش رہنے کے بعد کہا: "لیکن ابھی آپ کی وہ عمر تو آئی۔

ہی نہیں جس میں دوسرے جہاں کی فکر کی جاتی ہے۔ آپ مجھ سے صرف تین ہی
برس تو بڑے ہیں !"

رتیش نے ہنس کر کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری عمر تو اور بھی ابھی دوسری
دنیا کی فکر کرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ بھگوان ایسا ہی کریں تم دیر تک زندہ رہو
لیکن اپنے بارے میں میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ آج کا روز ہی میرا آخری دن
نہیں "

رتیش کی اس بات میں جو چھپا ہوا حملہ تھا، وہ شاید رما نہیں سمجھ سکی، کیا؟ رما نے کچھ دیر
تک بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے بعد پوچھا "آپ کو سندھیا پوجا کرتے تو دیکھا نہیں۔
مندر میں کیا ہے کیا نہیں، یہ نہ دیکھا تو نہ سہی۔ لیکن کھانے کے لئے بیٹھتے وقت کیا
ایشور کا نام لینا بھی بھول گئے ہو؟"

رتیش نے دل ہی دل میں ہنس کر کہا "بھولا تو نہیں۔ لیکن سمجھتا ہوں کہ اگر بھول بھی
جاؤں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن آخر یہ کیوں پوچھتی ہو؟"

رما نے کہا "آپ کو پرلوک کی زیادہ فکر ہے نہ اس لئے پوچھتی ہوں"

رتیش نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے
پھر رما نے آہستہ آہستہ کہا "دیکھئے، مجھے لمبی عمر کی دعا دینا۔ میرے لئے بد دعا کے برابر
ہے

مجھے زندگی کی دعا دینے والے   تری سادگی پہ ہنسی آ رہی ہے

ہم مارواڑیوں کے گھروں میں کبھی کسی بیوہ کے لئے اس کا قریب دیر تک جینے
کی دعا نہیں کرتا"

تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر پھر بولی "یہ بات تو سچ نہیں کہ میں مرنے کے لئے
بالکل پیر پھیلائے کھڑی ہوں۔ لیکن زیادہ دنوں تک زندہ رہنے کا خیال

آنے سے بھی مجھے خوف محسوس ہوتا ہے بلکہ آپ کے بارے میں تو یہ بات ہے کہ میں آپ سے زور دے کر کوئی بات کہنا تو میرے لئے ڈھٹائی ہے۔ لیکن دنیا میں قدم رکھنے کے بعد جب دوسروں کے لئے مغز پچی کرنا خود آپ ہی کرلگیں معلوم ہوا تو آپ میری یہ بات یاد کیجئے گا۔"

اس کے جواب میں رمیش نے ایک لمبا سانس چھوڑا مگر تھوڑی دیر بعد انہوں نے رما ہی کی طرح آہستہ آہستہ کہا: "لیکن میں تم سے، خوب یاد کر کے کہتا ہوں کہ اس وقت تو یہ بات مجھے کسی طرح بھی یاد نہیں آتی۔ سدا میں تو تمہارا کوئی نہیں ہوں بلکہ تمہارے راستے کا کانٹا ہوں۔ پھر بھی ایک پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آخر تم نے میری جتنی خاطر تواضع کی ہے اتنی خاطر جو لوگ اپنے رشتہ داروں سے روز پاتے ہیں میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ دوسروں کے دکھ اور تکالیف کو دیکھ کر پاگل ہو کر دوڑ پڑتے ہوں گے ابھی میں تنہا بیٹھا یہی سوچ رہا تھا کہ تم نے میری ساری زندگی ایک ہی لمحے میں شروع سے آخر تک بدل دی۔ آج تک کسی نے مجھے اس طرح کھانے کے لئے نہیں کہا۔ کبھی کسی نے آج تک مجھے اتنی عزت اور اتنی محبت سے کھلایا۔ آج پہلی مرتبہ مجھے تمہارے پاس آ کر معلوم ہوا کہ کھانے میں بھی اتنی لذت اور اتنی راحت ہے۔"

یہ بات سن کر رما کا جسم سنسنی سے بار بار لرز اٹھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی سنبھل کر کہا: "لیکن اسے بھولنے آپ کو زیادہ دن نہ لگیں گے۔ اور پھر کبھی یاد بھی آئیگا تو بہت ہی معمولی طور پر!"

رمیش نے کوئی جواب نہ دیا۔ رما نے کہا: "مگر جا کر آپ برائی نہ کریں تو میں اسے ہی اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔"

رمیش نے پھر ایک ٹھنڈا سانس لے کر آہستہ آہستہ کہا: "نہیں رما برائی نہیں کرونگا اور تعریف بھی نہ کرتا پھروں گا۔ میرا آج کا دل تحقیر و تعریف دونوں کے احاطے سے باہر ہے۔"

رتنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے تو وہ تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں تنہائی میں اس کی آنکھوں سے بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں۔

---

(۱۱)

دو دن لگاتار پانی برسنے کے بعد آج تیسرے پہر آسمان کچھ صاف ہوا تھا۔ جنا مناسب میں گوپال سرکار کے پاس بیٹھے رمیش اپنی زمینداری کا حساب دیکھ رہے تھے۔ اچانک تقریباً بیس بائیس کسان روتے ہوئے آکر کہنے لگے بابو اس بار ہمیں بچا لیجئے۔ اگر آپ نے نہ بچایا تو ہمیں اپنے بال بچوں کا ہاتھ پکڑ کر بھیک مانگنی پڑیگی۔"

رمیش نے حیران ہو کر پوچھا "بات کیا ہے؟"

کسانوں نے کہا "ہم لوگوں کی سو بیگھہ زمین پانی میں ڈوب گئی۔ اگر پانی جانے لگا تو ہمارا دھان تباہ ہو جائیگا۔ پانچ گاؤں کا ایک گھر بھی بھوکوں مرے بغیر نہ رہیگا۔"

رمیش کچھ سمجھے نہیں۔ گوپال سرکار نے ان لوگوں سے ایک دو سوال کر کے تمام باتیں سمجھا کر کہا "اس سو بیگھہ کی کھیتی ہی پر پانچ گاؤں کا بھروسا ہے۔ سب کسانوں کی کچھ زمین اس میں ہے۔ اس کے مشرق بہت بڑا سرکاری بند ہے اور مغرب طرف اونچا گاؤں ہے۔ صرف جنوبی سمت گھوشال اور مکرجی کا بند ہے۔ اسی سے پانی نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بند سے لگا ہوا تالاب ہے جس سے ہر سال تقریباً دو سو روپے کی مچھلیاں پکڑ کر بیچی جاتی ہیں۔ اسی لئے زمیندار

دینی بابو نے وہاں سخت پہرہ لگا رکھا ہے۔ یہ سب لوگ آج صبح ہی سے ان کے یہاں دھرنا دے جانے بیٹھے تھے۔ ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر روتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ رمیش نے اور کچھ سننے کی کوشش نہ کی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر چلا گئے۔ جب وہ دینی کے یہاں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ دینی بابو ایک تکئے کے سہارے بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ ان کے پاس ہی مالدار بیٹھے تھے۔ شاید اسی بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔

رمیش نے کوئی تمہید باندھے بغیر کہا :"تالاب کا بند روک رکھنے سے تو اب کام نہیں چلے گا۔ اسی وقت اسے توڑ دینا چاہیئے۔"

دینی نے حقہ مالدار کے ہاتھ میں دے دیا اور سر اٹھا کر پوچھا :"کونسا بند؟"

رمیش جوش میں آ کر تو آئے ہی تھے۔ انہوں نے غضب ناک ہو کر کہا :"بڑے بھیا۔ تالاب کے بند اور کتنے ہیں؟ وہ بند اگر نہ کاٹا جائیگا تو سارا دھان سڑ جائیگا۔ آپ پانی نکال دینے کی اجازت دے دیجئے۔"

دینی نے کہا :"تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ اس پانی کے ساتھ ہی دو تین سو روپے کی مچھلیاں بھی نکل جائیں گی؟ کسان دینگے یا تم؟"

رمیش نے غصے کو روک کر کہا :"کسان بیچارے غریب ہیں۔ وہ تو دے ہی نہیں سکتے۔ رہ گیا میں، تو میں کیوں دوں، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

دینی نے جواب دیا :"تو پھر میری سمجھ میں بھی یہ نہیں آتا کہ آخر میں ہی اتنا نقصان کیوں کروں؟" اس کے بعد انہوں نے مالدار کی طرف دیکھ کر کہا :"چاچا۔ بس اسی طرح ہمارے بھائی زمینداری کی حفاظت کرینگے! رمیش وہ حرام زادے آج صبح ہی سے یہاں پڑے رو رہے تھے۔ میں سب جانتا ہوں۔ کیا تمہارے یہاں کوئی دربان نہ تھا؟ یا اس کے پیروں میں چمڑے کا جوتا نہ تھا۔

جاؤ گھر جاکر اس کا انتظام کرو۔ پانی خود ہی مل جائیگا۔"

وینی بابو یہ کہکر اور اس گدار کے ساتھ مل کر ہی ہی کرکے اپنے اس مذاق پر خود ہی ہنسنے لگے رمیش سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے بہت مشکل سے اپنے آپ کو روک کر نرم لہجے میں کہا۔" بڑے بھیا آپ ذرا اچھی طرح غور کریں۔ اگر ہم تینوں گھر اپنے دو سو روپیوں کا نقصان بچا لینگے۔ تو ان غریبوں کا سال بھر کا اناج مارا جائے گا۔ اور اس طرح ان کا پانچ سات ہزار روپے کا نقصان ہو جائیگا۔"

وینی نے ہاتھ پلٹ کر کہا۔" ہوگا تو ہوا کرے۔ خواہ ان کا پانچ ہزار کا نقصان ہو یا پچاس ہزار کا۔ میرا سارا صدر کھودنے سے بھی تو دو پیسے نہ نکلیں گے۔ پھر میں ان بدمعاشوں کے لئے دو سو روپے کا نقصان کروں؟"

رمیش نے آخری کوشش کرتے ہوئے کہا۔" آخر یہ لوگ سال بھر کھائینگے کیا؟"

رمیش نے گویا یہ بہت بڑی ہنسی کی بات کی ہو۔ اس طرح وینی بابو نے ایکبار ادھر اور ایک بار ادھر بل کھا کر سر ہلا کر، ہنس کر، ملٹوک کر آخر میں کہا۔" کھائیں گے کیا، دیکھ لینا سب سالے ہمارے ہی پاس اپنی زمین رہن رکھ کر روپے ادھار لینے کے لئے دوڑے آئیں گے۔ بھائی ذرا اپنا دماغ ٹھنڈا کر کے کام کرو۔ بڑے بوڑھے اسی طرح جوڑ جوڑ کر یہ ایک آدھ چھوٹا ٹکڑا ہم لوگوں کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ اور یہی ہم لوگوں کو بڑھا کر، سنبھال کر، کھا پی کر، پھر اپنے بال بچوں کے لئے چھوڑ جانا ہوگا۔ پوچھتے ہو وہ کھائیں گے کیا؟ کھائیں گے ادھار لے کر۔ نہیں تو یہ سالے بھوکوں جاتی کے کیوں کہلاتے؟"

نفرت، شرم اور غم و غصہ کے مارے رمیش کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے لہجے کو پُر سکون رکھ کر کہا۔" جب

اپنے عزم ہی کر لیا ہے کہ ان لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں کریں گے۔ تو پھر یہاں کھڑے رہکر بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں اب رتنا کے پاس جاتا ہوں۔ اگر وہ مان گئیں تو پھر آپکے انکار سے کچھ نہ ہوگا۔"

دتینی کے چہرے پر سفیدی آگئی۔ انہوں نے کہا: "اچھی بات ہے۔ جا کر دیکھو لو۔ اس کی رائے مجھ سے مختلف نہیں۔ بھائی۔ وہ معمولی لڑکی نہیں۔ اسے فریب دینا آسان نہیں ــــــ اور تم لڑ بھی تو سکے ہو۔ تمہارے باپ تک کو اس نے ناکوں چنے چبوا کر چھوڑا تھا۔ گویا چاچا۔"

چچا کے اتفاق و اختلاف سے رمیش کو کوئی تعلق نہ تھا۔ اور دتینی کی اس انتہائی تحقیر آمیز بات کا جواب دینے کو بھی ان کا جی نہ چاہا۔ وہ جواب دئے بغیر ہی باہر نکل گئے۔

رتنا نے تلسی کے پودے کے آگے دیا جلا کر اور پرنام کر کے سر اٹھایا ہی تھا کہ وہ حیرت کے مارے ششدر رہ گئی۔ ٹھیک سامنے رمیش کھڑے تھے۔ وہ اپنا سر کا آنچل اپنے گلے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس نے ابھی رمیش ہی کو پرنام کر کے سر اٹھایا ہو۔ اس وقت رمیش کو جوش و غضب کے باعث یہ یاد نہ رہ گیا تھا کہ مالا موسی نے یہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ اسی لئے وہ سیدھے اندر آ پہنچے تھے۔ اور اگر اس وقت ــ الت میں دیکھ کر چپ چاپ کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ دونوں کی تقریباً ایک ــ کے بعد ــ ملاقات ہوئی تھی۔

رمیش ــ ــ : "یقیناً تم سب باتیں سن چکی ہوگی۔ میں سنجد کا پانی باہر نکال دینے کے لئے تمہاری منظوری لینے آیا ہوں۔"

اب رتنا کی حیرت ــ رہ گئی۔ اس نے سر کا آنچل کھینچ کر کہا: "بھلا یہ کیسے ہوگا؟ پھر بڑے چچا کی بدنامی ــ ہے۔"

"جانتا ہوں، نہیں ہے۔ لیکن اکیلے ان کی رائے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

رتنا نے کچھ دیر تک سوچ کر کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ بند کا پانی نکال دینا چاہیئے۔ لیکن مچھلیوں کو روک رکھنے کا کیا طریقہ ہوگا؟"

رمیش نے کہا "اتنے پانی میں کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس سال روپیوں کا جو نقصان ہوگا۔ وہ ہم لوگوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ ورنہ سارا گاؤں مارا جائیگا۔"

رتنا خاموش رہی۔ رمیش نے پھر کہا "تو پھر تم منظوری دیتی ہو نہ؟"

رتنا نے میٹھے لہجے میں جواب دیا "نہیں میں اتنے روپیوں کا نقصان نہیں کر سکوں گی۔"

رمیش حیرت کے مارے پاگل سے ہو کر رہ گئے۔ انہیں کبھی ایسے جواب کی امید نہ تھی۔ بلکہ نہ جانے کس طرح ان کے دل میں یہ بات بیٹھ چکی تھی۔ کہ میرے اصرار پر رتنا کسی طرح انکار نہ کر سکے گی۔ شاید رتنا نے سر اٹھائے بغیر ہی رمیش کے دل کی حالت احساس کر لیا۔ اس نے کہا "اس کے علاوہ یہ تمام جائداد میرے بھائی کی ہے۔ میں تو صرف نگران و سرپرست ہوں۔"

رمیش نے کہا "نہیں۔ اس میں آدھا حصہ تمہارا بھی ہے۔"

رتنا نے کہا "صرف برائے نام! بابو جی بخوبی جانتے تھے۔ کہ یہ ساری جائداد آخر کار جتندر ہی کو ملے گی۔ اسی لئے وہ آدھی جائداد میرے نام لکھ گئے ہیں۔"

پھر بھی رمیش نے درخواست کے لہجے میں کہا "رتنا یہ کتنے سے روپے ہیں؟ اس طرف تمہاری حالت سب لوگوں سے اچھی شمار ہوتی ہے۔ تمہارے لئے یہ نقصان کوئی نقصان ہی نہیں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں رتنا۔ اس کے لئے تم اتنے لوگوں کو فاقوں نہ مارو۔ میں تم سے بالکل ٹھیک کہتا ہوں کہ میں نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی بے مہر اور سنگدل ہو سکتی ہو!"

رتنا نے اسی طرح نرم و نازک انداز سے جواب دیا "اپنا نقصان نہیں کر سکتی۔

اس لئے اگر میں سنگدل ہوں تو سنگدل ہی سہی ۔ اگر تمہیں اتنا ہی رحم آتا ہے تو خود ہی وہ نقصان پورا کر دیجئے نہ ؟" اس کے اس میٹھے اور نازک لہجے میں مذاق کا احساس کر کے رمیش جل اٹھے اور بولے "آدمی کھرا ہے کہ نہیں ، یہ روپے کا معاملہ آنے پر ہی پہچانا جاتا ہے ، یہاں کھوٹ نہیں چلتا ، خالی باتیں نہیں چلتیں ، اس لئے یہاں انسان کی حقیقی شکل و صورت پہچانی جاتی ہے ۔ آج تمہاری بھی وہی شکل و صورت ظاہر ہو گئی ہے ۔ لیکن میں نے کبھی تمہیں ایسا نہیں سمجھا تھا ۔ ہمیشہ سے یہی سوچا آیا تھا ۔ کہ تم اس کی نسبت بلند ، بہت بلند ہو ۔ لیکن تم وہ نہیں ہو ۔ تمہیں سنگدل کہنا بھی بھول ہے ۔ تم بہت ہی ہیچ ہو ، بہت ہی چھوٹی ہو ۔"

انتہائی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رما نے کہا " میں کیا ہوں ؟"

رمیش نے کہا " تم انتہائی ہیچ اور ذلیل ہو ۔ میں کتنا زیادہ مضطرب ہو اٹھا ہوں یہ تم نے جان لیا ہے ۔ اسی لئے تم نے مجھ سے نقصان پورا کرنے کے لئے کہا ۔ بڑے بھیا بھی اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہہ سکے ۔ جو بات مرد ہونے پر بھی ان کے منہ سے نہ نکل سکی ۔ عورت ہونے پر بھی اس کے کہنے میں تمہیں حجاب معلوم نہ ہوا ۔ میں اس سے بھی کہیں زیادہ نقصان پورا کر سکتا ہوں ۔ لیکن رما آج میں ایک بات تم سے کہے جاتا ہوں ۔ دنیا میں جتنے پاپ ہیں ۔ ان سب سے بڑھ کر پاپ انسان کی ہمدردی پر ظلم کرنا ہے ۔ آج تم نے وہی کر کے مجھ سے روپے وصول کرنے کی کوشش کی ہے ۔"

رما پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ گئی ۔ اس کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی ۔ رمیش نے پھر اسی طرح پُرسکون لیکن سخت لہجے میں کہا " یہ ٹھیک ہے کہ تم سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ میری کمزوری کس جگہ ہے ۔ تم میری کمزور رگ کو جانتی ہو ۔ لیکن میں کہے جاتا ہوں ۔ کہ اس جگہ ٹھیس لگنے سے اب ایک بوند بھی رس نہیں ٹپک سکے گی ۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی بتائے جاتا ہوں کہ میں کیا

کردں گا۔ میں ابھی جاکر زبردستی بندھ توڑ دوں گا۔ تم لوگوں سے ہوسکے تو روکنے کی کوشش کر دیکھو۔"

رمیش کو یہ کہہ کر چلے جاتے دیکھ کر رما نے پکارا اور جب آواز سن کر وہ پاس آکھڑے ہوئے تو کہا "میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر آپ نے میری جو اتنی بے عزتی کی۔ اس کا میں کوئی جواب نہیں دینا چاہتی۔ لیکن آپ یہ کام کسی طرح بھی کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

رمیش نے پوچھا "کیوں؟"

رما نے کہا "کیونکہ آپ کے اتنی تحقیر کرنے پر بھی میں آپ سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتی۔"

یہ کہتے وقت رما کے چہرے کا رنگ کیسا غیر قدرتی طور پر زرد پڑ گیا اور بات کہتے کہتے کس طرح اس کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ یہ رمیش نے شام کی تاریکی کے باوجود دیکھ لیا۔ لیکن اس وقت رمیش کے پاس نہ تو نفسیات پر تنقید کرنے کا موقع تھا۔ اور نہ ایسا کرنے کی ان کی خواہش ہی تھی۔ اس لئے انہوں نے فوراً جواب دیا "لڑائی جھگڑا میں بھی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اب میرے نزدیک تمہارے ان نیک جذبات کی کوئی قیمت ہی نہیں رہ گئی۔ خیر کچھ بھی ہو۔ اب افہام و تفہیم کی ضرورت ہی نہیں۔ میں جاتا ہوں۔"

موسی اوپر ٹھاکر جی والی کوٹھڑی میں تھی۔ اس لئے اسے ان سب باتوں کا پتا نہ چلا۔ نیچے آکر اس نے دیکھا کہ رما اپنے ساتھ خادمہ کو لے کر باہر جارہی ہے۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

"رما اس کیچڑ پانی میں رات کے وقت کہاں جارہی ہو؟"

رما نے کہا "موسی! ذرا بڑے بھیا کے یہاں جارہی ہوں۔"

خادمہ نے کہا "موتی، اب تو راستے میں کیچڑ کا کہیں نام بھی نہیں۔ چھوٹے بابو نے ایسا اچھا راستہ بنوا دیا ہے کہ اگر بوڑھا بھی گر پڑے تو اٹھا لیا جائے۔ بھگوان انہیں لمبی عمر دیں۔ سانپوں سے غریب دکھیوں کی جان بچا لی۔"

اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بج گئے تھے۔ ونی کے جھنڈی منڈپ سے بہت سے لڑکوں کے بیٹھے ہوئے گلے کی آواز آ رہی تھی۔ آسمان سے بادل بہت کچھ چھٹ گئے تھے اور تریودشی کی چاندنی آ کر برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ وہیں ایک کھمبے کے سہارے ایک خوفناک صورت کا ادھیڑ عمر مسلمان آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس کے سارے منہ پر تازہ خون جما ہوا تھا۔ جسم کے کپڑے بھی خون سے تر تھے۔ لیکن وہ خاموش تھا۔ ونیا بہت ہی اصرار سے کہہ رہے تھے "اکبر میری بات مانو۔ تھانے چلے چلو۔ اگر میں سات برس کے لئے جیل نہ بھجوا دوں تو گھوشال خاندان کا فرد نہیں۔" پھر پیچھے دیکھ کر بولا۔ "رما ایک بار تم بھی کہو نا، خاموش کیوں ہو؟"

لیکن رما ویسے ہی پتھر کی پتلی کی طرح بیٹھی رہی۔ اب اکبر علی آنکھیں کھول کر ذرا تن کر بیٹھ گیا اور بولا "شاباش ضرور چھوٹے بابو نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے۔ لاٹھی چلانا خوب جانتے ہیں!"

"ونیا نے کچھ گھبرا کر اور کچھ غضبناک ہو کر کہا "اکبر ایسی بات کہنے کے لئے تو میں نہیں سمجھا رہا ہوں۔ کس کی لاٹھی کی چوٹ سے تم زخمی ہوئے۔ اس لونڈے کی لاٹھی سے یا اس کے نوکر کی لاٹھی سے؟"

اکبر کے ہونٹوں پر کچھ مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا "اس ٹھنگنے نوکر کی لاٹھی سے؟ چھوٹے بابو وہ سالا لاٹھی چلانا کیا جانے؟ کیوں گوہر، تمہاری تو پہلی ہی چوٹ سے رہ بیٹھ گیا تھا نا؟"

اکبر کے دونوں لڑکے تھوڑی دُور بالکل سمٹے ہوئے بیٹھے تھے ۔ وہ بھی زخمی ہوئے تھے ۔ گوبر نے صرف سر ہلا کر حامی بھری منہ سے کچھ نہیں کہا ۔ اکبر کہنے لگا " اگر میرے ہاتھ کی چوٹ بیٹھتی تو وہ سالا زندہ نہ بچتا ۔ وہ تو گوبر ہی کی لاٹھی سے وہ باپ رے باپ کہہ کے بیٹھ گیا بڑے بابو ۔"

رتنا اٹھ کر ان لوگوں کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔ اکبر ان لوگوں کے بیر پور گاؤں کی رعایا تھا ۔ پچھلے دنوں لاٹھی کے زور سے ان لوگوں کا بہت سی جائداد پر قبضہ کرا دیا تھا ۔ اسی لئے آج شام کے بعد غصے اور بے عزتی کی آگ سے جل بھن کر رتنا نے اُسے بلوا بھیجا تھا اور سیندر پر پہرا دینے کے لئے بھیج دیا تھا ۔ اس نے ایک بار اچھی طرح دیکھ لینا چاہا تھا کہ رمیش اس " لٹھ باز " نوکر کے بل پر کیا کر سکتا ہے ؟ لیکن اس نے خواب میں بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ وہ خود اتنے زبردست " لٹھیت " ہیں ۔

اکبر نے رتنا کی طرف دیکھ کر کہا " مالکن ! اس وقت چھوٹے بابو نے اس سالے کی لاٹھی اٹھا لی اور وہ خود جا کر سیندر کو روک کر کھڑے ہو گئے ۔ ہم تینوں باپ بیٹے مل کر بھی انہیں وہاں سے نہ ہٹا سکے ۔ اندھیرے میں ان کی آنکھیں چیتے کی طرح چمکنے لگیں ۔ انہوں نے کہا ۔۔۔۔۔ اکبر تم بڑھے آدمی ہو ہٹ جاؤ ۔ اگر سیندر کٹ گیا ۔ تو سارے گاؤں کے آدمی بھوکوں مر جائیں گے ۔ اس لئے وہ ضرور کاٹا جائے گا ۔ اپنے گاؤں میں تم لوگوں کی بھی زمین ہے ۔ اب تم سمجھ دیکھو کہ اگر تمہارا سب کچھ برباد ہو جائے تو تمہیں کیسا معلوم ہوگا ؟ میں نے سلام کر کے کہا ۔۔۔۔ چھوٹے بابو ! اللہ کی قسم ! تم ایک بار سامنے سے ہٹ جاؤ ۔ تمہاری آڑ میں کھڑے ہو کر منہ پر کپڑا لپیٹ کر یہ جو لوگ دھڑا دھڑ کدال چلا رہے ہیں ۔ میں ان کا سر توڑ دوں ۔"

دینی اپنا غصہ نہ سنبھال سکنے کے باعث درمیان ہی میں چلا کر بول اٹھی " بے ایمان سالا اتنے سلام بجا لا کر آیا ہے ۔ اور یہاں شیخی بگھار رہا ہے ! "

تینوں باپ بیٹوں نے ایک ساتھ ہاتھ اٹھا لئے۔ اکبر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"خبردار بڑے بابو بے ایمان نہ کہنا۔ ہم لوگ مسلمان ہیں۔ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد اکبر نے اپنے ہاتھ سے سر کا کچھ خون پونچھ کر اور رتنا کی طرف دیکھ کر کہا "مالکن! یہ بے ایمان کہتے ہیں! بڑے بابو یہاں گھر میں بیٹھے ہوئے بے ایمان کہتے ہیں۔ اگر وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ چھوٹے بابو کیا چیز ہیں۔" دینا بابو نے منہ بگاڑ کر کہا "تو بھلے چل کر ہی بتا۔ دیکھ چھوٹے بابو کیا چیز ہیں۔ بس کہہ دیا کہ ہم بند پر پہرہ دے رہے تھے۔ چھوٹے بابو چڑھ آئے اور ہمیں مارا۔"

اکبر نے زبان دانتوں تلے دبا کر کہا "توبہ۔ توبہ! بڑے بابو۔ آپ دن کو رات بنانے کے لئے کہتے ہیں؟"

دینی نے کہا "اچھا تو پھر کوئی بات کہہ دینا۔ آج جا کر پہلے اپنے زخم تو دکھا آؤ۔ کل وارنٹ نکلوا کر اسے حوالات میں بند کرا دونگا۔ رتنا، ذرا تم بھی اسے اچھی طرح سمجھاؤ۔ ایسا اچھا موقعہ پھر کبھی ہاتھ نہ آئیگا۔"

رتنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ایک بار اکبر کے منہ کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ اکبر نے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں مالکن مجھ سے یہ نہ ہوگا۔"

دینی نے دھمکا کر کہا "یہ ہوگا کیوں نہیں؟"

اب کی اکبر نے بھی چلا کر کہا "بڑے بابو! آپ بھی کیا کہتے ہیں! کیا مجھے شرم حیا نہیں؟ مجھے چار گاؤں کے آدمی کیا "سردار" نہیں کہتے؟ مالکن، اگر آپ کا حکم ہو تو میں مجرم بن کر جیل کاٹ سکتا ہوں۔ لیکن فریادی کس منہ سے

ہن کر جاؤں ؟"

رتنا نے نرم لہجے میں صرف ایک بار پوچھا" تو کیوں اکبر! بھلے نہیں جا سکو گے ؟"

اکبر نے زور سے سر ہلا کر کہا "نہیں مالکن! اور سب کچھ کر سکتا ہوں، لیکن صدر میں جا کر اپنے بدن کے زخم نہیں دکھا سکتا۔ ٹھاکر گوہر! چلو گھر چلیں ہم لوگوں سے نالش فریاد نہ ہو سکے گی۔"

یہ کہہ کر وہ سب لوگ اٹھنے کی تیاری کرنے لگے۔ تربھی غضب آمیز مایوسی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے دل ہی دل میں گالی گلوچ کرنے لگے۔ اور رتنا کی مسلسل خاموشی کا کچھ بھی مطلب نہ سمجھ سکنے کے باعث آگ میں جلنے لگے۔ جب ہر طرح کی عاجزی، منت خوشامد، ڈانٹ ڈپٹ اور غصے وغیرہ کو ٹھکرا کر اکبر علی اپنے لڑکوں کو لے کر چلا گیا —— اس وقت رتنا کے دل کو چھید کر ایک گہرا سانس نکل پڑا اور بے وجہ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آج اتنی بڑی تحقیر، اتنی بڑی بے عزتی، اتنی بڑی شکست اور ایسی ناکامی ہونے پر بھی اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس کے دل پر سے ایک بہت بھاری بوجھ ہٹ گیا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہوا اس کی وجہ وہ کسی طرح نہ سمجھ سکی۔ ساری رات اسے نیند نہ آئی اس دن اس نے تارکیشور میں سامنے بیٹھ کر رمیش کو جو کھانا کھلایا تھا۔ اس کا منظر اس کی آنکھوں میں پھرنے لگا۔ جوں جوں اسے خیال آنے لگا کہ اس حسین اور نازک جسم کے اندر اتنا جلال، اتنی طاقت کس طرح ایسی آزادی سے رہتے ہیں۔ ویسے ہی اس کی آنکھوں کے پانی سے اس کا تمام چہرہ تر ہونے لگا۔

---

(۱۲)

رمیش نے لڑکپن میں کسی وقت رما سے پیار کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پیار وہ محبت، بالکل لڑکپن کی محبت تھی۔ لیکن وہ کتنی گہری تھی۔ اس کا احساس پہلی مرتبہ انہیں تارکیشور میں ہوا ——— اور وہ بھی کتنی سنجیدہ اور گہری تھی۔ اس کا سب سے زیادہ پتہ اس دن چلا جب وہ شام کی تاریکی میں رما کے تمام تعلقات چھٹی میں ملا کر اس کے گھر سے چلے آئے تھے۔ اس کے بعد اس روز کے رات والے حادثہ کے بعد سے رما کی حالت ہی رمیش کو پلیگ کی وبا کے مانند ویرانی میں دکھائی نظر آتی تھی۔ لیکن رمیش نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ اس سے میرے سب کام دھندے، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا۔ یہاں تک کہ غور و فکر اور مطالعہ بھی اتنا بے کیف ہو جائیگا۔ اس دماغی پریشانی کے باعث اب وہ لمحہ بھر کے لئے بھی گاؤں میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن اسی عرصے میں ایک اور حادثہ ہو گیا۔ جس سے وہ پھر گویا ٹن کر سیدھے بیٹھ گئے۔

تالاب کے اس پار پیر پورہ گاؤں ہی میں ان لوگوں کی زمینداری تھی۔ وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ ایک دن وہ جتھا بنا کر رمیش کے پاس آئے اور فریاد پیش کی کہ ہیں تو ہم لوگ آپ کی رعایا ہی۔ لیکن پھر بھی ہمارے لڑکوں بچوں کو صرف مسلمان ہونے کے باعث اس گاؤں کے سکول میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا۔ ہم لوگوں نے کئی بار کوشش کی۔ لیکن مایوس ہونا پڑا۔ ماسٹر کسی طرح ہمارے لڑکوں کو داخل نہیں کرتے۔ رمیش نے حیران اور ناراض ہو کر کہا: "اس طرح کی بے انصافی اور ظلم تو میں نے کبھی نہیں سنا تم اپنے لڑکوں کو آج ہی لے چلو۔ میں خود چلوں گا اور وہاں کھڑا ہو کر اپنے سامنے تمہارے لڑکوں کو داخل کرا دونگا"۔

ان لوگوں نے کہا "اگرچہ ہم لوگ آپ کی رعایا ہیں بلکہ گاؤں وغیرہ بھی زمین جوتتے بوتے ہیں، اس لئے ہندوؤں کی طرح زمیندار سے نہیں ڈرتے۔ لیکن اس معاملے میں بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ اس سے جھگڑا ہی بڑھیگا، اس لئے ہم لوگ اپنے ہی یہاں ایک چھوٹا سا سکول قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی سی امداد کردیں تو سب کام ہو جائے"۔

رمیش خود بھی لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ گئے تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کی لڑائی جھگڑا نہ بڑھانے کی رائے ہی ٹھیک معلوم ہوئی۔ انہوں نے حامی بھرلی اور اسی وقت سے وہ ایک سکول کے قیام کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں کے نزدیک آکر رمیش نے صرف اپنے آپ کو نہ صرف آزاد اور مسرور ہی محسوس کیا بلکہ ادھر سال بھر سے انہیں اپنے اندر جو کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ وہ بھی گویا آہستہ آہستہ پوری ہونے لگی۔ رمیش نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنے کو آں پور کے ہندو پڑوسیوں کی طرح بات بات میں لڑائی جھگڑا نہیں کرتے اور کرتے بھی ہیں تو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سیدھے صدر پہنچ کر دعوے دائر نہیں کرتے، بلکہ اپنے مکھیوں کا فیصلہ ہی خواہ مطمئن ہو کر۔ یا غیر مطمئن ہو کر مان لیتے ہیں۔ خصوصاً کسی مصیبت کے وقت یہ لوگ جس طرح جی جان سے ایک دوسرے کی امداد کرنے کے لئے پہنچ جاتے ہیں، اس طرح رمیش نے نہ تو اس گاؤں کے بھلے ہندو آدمیوں کو اور نہ چھوٹی جاتی کے لوگوں کو ایک دوسرے کی مدد کرتے کبھی دیکھا تھا۔

ایک تو چھوت چھات چھوٹے بڑے اور ذات برادری کے اختلاف پر رمیش کو پہلی کبھی اعتقاد نہ تھا۔ اس پر جب انہوں نے پاس ہی پاس بسنے والے ان دو گاؤں کا آپس میں موازنہ کیا تو ان کی یہ بے اعتقادی بڑھ کر دوگنا ہو گئی۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ ہندوؤں کا دھرم اور ان کی سماجی رقابت و تقسیم ہی اس رشک

وحسد کا باعث ہے۔ مسلمان مذہب کے معاملے میں ایک دوسرے کے برابر ہوتے ہیں۔ اس لئے اتحاد کا رشتہ جیسا مضبوط ان میں ہے۔ وہ ہندوؤں میں نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا اور جب ذات پات کی تفریق دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہاں تک کہ گاؤں میں اس کا چھیڑنا بھی تقریباً ناممکن ہے۔ تو ان کے آپس کے لڑائی جھگڑے کم کرنے ان میں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کی کوشش فضول کا دوسرے۔ ادھر کچھ برس سے وہ اپنے گاؤں میں اس کام کے لئے جو بیکار کوشش کر رہے تھے۔ اس کے لئے انہیں بیحد ندامت محسوس ہونے لگی۔ انہیں یقین ہو گیا۔ کہ ان لوگوں نے ہمیشہ سے اسی طرح لڑتے جھگڑتے۔ ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے زندگی گذار لی ہے۔ اور آئندہ بھی اسی طرح بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ ان لوگوں کا بھی کبھی کسی بھی طرح بھلا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے سوچا کہ یہ بات پکی تو کر لینی چاہئے۔ کئی وجوہ سے بہت دنوں سے وہ تائی جی سے نہ مل سکے تھے۔ اس دن کی مارپیٹ کے بعد ایک طرح سے جان بوجھ کر ہی وہ اس طرف نہیں گئے تھے۔ آج صبح ہی اٹھ کر وہ سیدھے ان کے دروازے پر جا پہنچے۔ تائی جی کی عقل وفراست اور شرافت پر انہیں اتنا اعتماد ہے۔ ایسے وہ خود بھی نہ جانتے تھے۔ رمیش نے قدرے حیرت سے دیکھا کہ تائی جی اتنے سویرے ہی اشنان وغیرہ کر کے سب کاموں سے فارغ ہو چکی ہیں اور دھندلی روشنی میں اپنی کوٹھری میں زمین پر بیٹھی، چشمہ لگائے ایک کتاب پڑھ رہی ہیں۔ تائی جی کو بھی کم حیرت نہ ہوئی۔ انہوں نے کتاب بند کر دی اور رمیش کو عزت و محبت سے اندر بلا کر بٹھایا اور ان کے منہ کی طرف دیکھ کر پوچھا "ارے آج اتنے سویرے؟"

رمیش نے کہا "تائی جی! ادھر بہت دنوں سے میں نے تمہیں دیکھا نہ تھا۔ میں پیرپور میں ایک سکول کھولنا چاہتا ہوں۔"

دشو لیشوری نے کہا "ہاں میں نے بھی سُنا ہے۔ لیکن آج کل ہم لوگوں کے سکول میں پڑھانے کیوں نہیں جاتا؟"

رمیش نے کہا "تائی جی ، یہی بتانے کے لئے تو آیا ہوں۔ ان لوگوں کی بہتری کی کوشش کرنا بالکل فضول ہے۔ جو کبھی کسی کی بھلائی نہیں دیکھ سکتے اور جن میں اتنا غرور و تکبر ہے۔ ان لوگوں کے لئے محنت کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اُلٹے یہ لوگ اور بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ اب تو جن لوگوں کی بہتری میں واقعی بھلائی ہے۔ انہیں کے لئے محنت کروں گا۔"

تائی جی نے کہا "یہ بات تو کوئی نئی نہیں رمیش! اس دنیا میں جس کسی نے بہتری کا بھلائی کرنے کا بوجھ اپنے سر لیا ہے اس کے دشمنوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی رہی ہے۔ صرف اسی خوف سے جو لوگ پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ اگر انہی لوگوں کے گروہ میں تم بھی جا کر مل جاؤ گے تو بیٹا۔ کام کیسے چلے گا؟ بھگوان نے یہ بھاری بوجھ تمہارے ہی کندھوں پر ڈالا ہے اور تمہیں کو اسے اٹھانا ہو گا۔ اور کیوں رمیش! کیا تم ان لوگوں کے ہاتھ کا پانی پیتے ہو؟"

رمیش نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو تائی جی اتنے ہی میں یہ بات تمہارے کانوں تک آ پہنچی نا۔ اب تک تو میں نے ان لوگوں کے ہاتھ کا پانی نہیں پیا۔ لیکن پینے میں کوئی ہرج بھی نہیں سمجھتا۔ میں ذات پات اور چھوت چھات کو نہیں مانتا۔"

تائی جی نے ششدر ہو کر پوچھا "ذات پات کو نہیں مانتے؟ یہ کیا کوئی جھوٹی بات ہے؟ یا ذات پات کی تمیز کوئی چیز ہی نہیں جو تم نہ مانو گے؟"

رمیش نے کہا "تائی جی! ٹھیک یہی بات پوچھنے کے لئے میں آج تمہارے پاس آیا ہوں۔ یہ مانتا ہوں کہ ذات پات موجود ہے۔ لیکن یہ نہیں مانتا کہ وہ اچھی

چیز ہے"

"کیوں"

رمیش نے یکایک کچھ جوش میں آکر کہا "کیا یہ بھی تمہیں بتانا پڑیگا؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ سب نفاق اور لڑائی جھگڑے اسی کے باعث ہوتے ہیں؟ سماج میں جن لوگوں کو چھوٹی جاتی بنا کر رکھا گیا ہے۔ ان کے لئے یہ بالکل فطری ہے کہ وہ بڑی جاتی والوں پر رشک کریں، ان سے بغض و حسد رکھیں، اپنے چھوٹے ہونے کے خلاف بغاوت کریں اور اپنی ذلت سے آزاد ہونا چاہیں۔ ہندو، جمع کرنا نہیں جانتے، بکھیرنا، الگ الگ کرنا جانتے ہیں۔ گنوانا جانتے ہیں۔ اپنے آپ کی اور اپنی جاتی کی حفاظت کرنے اور اسے بڑھانے کا یہ جو بنیادی اصول ہے ہم لوگ اسے قبول نہیں کرتے اور اسی لئے روز بروز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ جو مردم شماری ہوا کرتی ہے۔ اگر اس کا نتیجہ ایک بار پڑھ لیں تو تم ڈر جاتیں اور تمہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کو چھوٹا ماننے اس کی جو بے عزتی کی جاتی ہے۔ ہاتھوں ہاتھ اس کا کیسا بدلہ ہم لوگوں کو مل رہا ہے؟ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ دوسری قوموں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد کس طرح کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود ہندوؤں کو ہوش نہیں آتا۔"

وشو لیشوری نے ہنس کر کہا "رمیش! تمہاری اتنی باتیں سن کر اب بھی تو مجھے ہوش نہیں آتا۔

میں مانتی ہوں کہ ہندو روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ کچھ اور ہی ہے۔ وہ بھی سماج کا قصور ضرور ہے۔ لیکن چھوٹی ذات کے ہندوؤں کا اپنی جات کو چھوڑ دینا اس کا باعث نہیں۔ کوئی ہندو صرف اس لئے اپنی ذات اور دھرم نہیں گنواتا کہ لوگ اسے چھوٹی ذات کا سمجھتے ہیں۔"

رمیش نے کہا "لیکن تائی جی پنڈت رگھ تو یہی اندازہ کرتے ہیں"
تائی جی نے کہا "بھیا اندازے کے خلاف تو کوئی دلیل چل نہیں سکتی۔ لیکن اگر کوئی یہ بتا سکے کہ فلاں گاؤں کے اتنے آدمیوں نے اس سال صرف اس لئے اپنا دھرم اسلام بدل دیا تھا کیونکہ انہیں چھوٹی ذات کا سمجھتے تھے۔ تو شاید پنڈتوں کی بات مانی جا سکے۔ لیکن میں یقینی طور پر جانتی ہوں کہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا۔"
رمیش نے پھر بھی بحث کرتے ہوئے کہا "لیکن تائی جی یہ بات تو مجھے بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ چھوٹی ذات کے ہیں۔ وہ بڑی یا اونچی ذات کے لوگوں پر رشک ضرور کرتے ہونگے۔"
رمیش کی اس تیز و پرجوش بات پر وشنو لیشوری پھر ہنس پڑیں اور بولیں "ٹھیک نہیں قطعاً ٹھیک نہیں بھیا! یہ تم لوگوں کا شہر نہیں دیہات میں کوئی اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ یہ چھوٹی ذات کا ہے اور وہ اونچی ذات کا ہے۔ جس طرح چھوٹے بھائی کے دل میں بڑے بھائی کے لئے رشک کا جذبہ نہیں ہوتا اور اس بات کے لئے اس کے دل میں کوئی رنج نہیں ہوتا کہ میری پیدائش بڑے بھائی سے سال دو سال بعد کیوں ہوئی۔ اسی طرح دیہات کے لوگوں کا حال ہے۔ یہاں کا شودروں کو اس بات کا ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا کہ ہم برہمن نہیں ہوئے۔ اور کہار بھی کائستھوں کے مانند ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ جس طرح بڑے بھائی کو پرنام کرنے میں چھوٹے بھائی کو کوئی شرم و ندامت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح کائستھ بھی پنڈتوں کے چرنوں کی خاک لینے میں ذرا بھی برا نہیں مانتے۔ بیٹا۔ یہ ذات پات کا امتیاز اس بغض و عناد کا باعث نہیں، کم از کم بنگال کے دیہات میں تو نہیں۔"
رمیش نے دل ہی دل میں حیران ہو کر کہا "تو پھر تائی جی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اسی گاؤں میں مسلمانوں کے اتنے گھر ہیں، لیکن ان میں تو اس طرح

کے لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔ وہاں تو جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو کوئی بھی اسے یہاں والوں کی طرح دھر دبانا نہیں چاہتا۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو۔ کہ اس دن رودر کا نپٹت کی لاش کو کوئی چھونے تک کے لئے نہیں گیا۔ کیونکہ ان کا پراشچت نہیں ہوا تھا "

وشولیشوری نے کہا "ہاں بیٹا سب جانتی ہوں۔ لیکن اس کی وجہ ذات پات کا امتیاز نہیں۔ وجہ یہی ہے۔ کہ مسلمانوں میں اب بھی ان کا حقیقی مذہب موجود ہے۔ اور ہم لوگوں میں وہ نہیں۔ جسے فی الحقیقت دھرم کہتے ہیں۔ وہ دیہات میں سے بالکل غائب ہے ـــــ اور رہ گئے ہیں صرف خیالات اور برے رسم و رواج اور ان سے ہونے والی حماقت بیماریاں!"

رمیش نے مایوسانہ انداز میں ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تائی جی! کیا اس کے سدھار کا کوئی طریقہ نہیں؟"

وشولیشوری نے کہا "ہے کیوں نہیں بیٹا! اسکی اصلاح صرف تعلیم ہی سے ہو سکتی ہے۔ جس راستے پر تم نے پیر رکھا ہے۔ صرف ایک راستہ ہے۔ اسی لئے میں تم سے برابر کہتی ہوں کہ تمہیں اپنی اس جنم بھومی کو کسی طرح بھی چھوڑ کر نہ جانا چاہیئے "

اس کے جواب میں رمیش کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ وشولیشوری نے روک کر کہا "تم کہوگے کہ مسلمانوں میں بھی تو جہالت کافی ہے۔ ضرور ہے۔ لیکن ان لوگوں کے زندہ مذہب نے انہیں سب طرف سے بچا رکھا ہے۔ رمیش! میں ایک بات کہتی ہوں۔ پیر پور گاؤں ہی میں تم پتہ لگاؤ گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہاں جعفر نامی ایک بڈھا آدمی ہے۔ جسے سب لوگوں نے مل کر برادری سے نکال رکھا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بیوہ سوتیلی ماں کو کھانے کو نہیں دیتا۔ لیکن ہمارے ان گووند گنگولی نے اپنی بیوہ بھاوج کو اپنے ہاتھ سے مارتے مارتے نیم جاں کر دیا۔ لیکن سماج

کی طرف سے انہیں اس کی سزا ملنا تو گویا چڑھتے ہیں اور خود ہی سماج کے سرپرست بے
مکھیا بنے بیٹھے ہیں۔ ہم لوگوں میں اس قسم کے نقائص کو انفرادی گناہ و ثواب مان لیا
گیا ہے۔ ان کی سزا بھگوان چاہیں گے تو دیں گے ورنہ چاہیں گے تو نہ دیں گے لیکن ہمارا
دیہاتی سماج ان کی طرف توجہ بھی نہ کریگا۔"

یہ نئی بات سُنکر ایک طرف تو رمیش حیران و ششدر رہ گئے لیکن دوسری طرف
ان کا دل اسی کو ابدی حقیقت کے روپ میں قبول کرنے سے ہچکچانے لگا۔ وشویشوری
نے ان کے دلی جذبات کو سمجھ کر کہا "بیٹا! تم نتیجہ ہی کو ذریعہ سمجھ کر نہ بھول بیٹھنا! اگر تم
اس بات کی جانچ کرنا چاہتے ہو کہ میرا کہنا ٹھیک ہے یا نہیں تو تم شہر کے دو چار قریبی گاؤں
میں گھوم آؤ۔ اور پھر ان کے ساتھ اپنے کوآن پور گاؤں کا مقابلہ کرکے دیکھو۔ سب باتیں
خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔"

کلکتے کے آس پاس کے ایک دو گاؤں سے رمیش خوب واقف تھے۔ ان کا فلسفہ دل
میں جاتے ہی گویا اچانک ان کی آنکھوں پر سے ایک سیاہ پردہ ہٹ گیا۔ وہ حیرت
و استعجاب سے وشویشوری کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن وہ اس طرف کچھ بھی
خیال نہ کرکے اپنی بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہنے لگیں "بیٹا!
اسی لئے تو میں تم سے بار بار کہتی ہوں کہ تم اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر نہ جانا تمہاری طرح ہمارے
گھر جو لوگ پڑھے ہوئے ہیں اور اگر تمہاری ہی طرح گاؤں میں لوٹ آتے تو گاؤں سے اپنا تمام
تعلق توڑ کر نہ چلے جاتے۔ تو ان کی ایسی بُری حالت نہ ہوتی۔ وہ کبھی گووند گنگولی کو سر پر اٹھا کر
تمہیں دور کر دینے کی کوشش نہ کرتے۔"

اب رمیش کو رما کی بات یاد آئی۔ اس لئے انہوں نے پھر ناملائمت کے انداز میں کہا۔
"دور چلے جانے میں اب مجھے بھی دکھ نہیں۔"

وشویشوری کا دھیان ان کے اس لہجے پر تو گیا۔ لیکن وہ وجہ نہ سمجھ سکیں۔

بولیں "نہیں رتیش، یہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ جب تم یہاں آ گئے ہو اور کام شروع کر دیا ہے تو اب اسے ادھورا ہی چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو مادرِ وطن تمہیں کبھی معاف نہ کریگی"

"کیوں تائی جی! مادرِ وطن میری اکیلے ہی کی تو نہیں؟"

تائی جی نے متاثر ہو کر کہا "تمہاری اکیلے کی کیا بیٹا! وہ صرف تمہاری ہی ماں ہے۔ دیکھتے نہیں کہ ماں اپنی زبان سے کبھی اپنی اولاد سے کچھ نہیں مانگتی! اسی لئے اتنے لوگوں کے ہونے کے باوجود اس کا رونا کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن تم نے اسے یہاں آتے ہی سن لیا"

رتیش نے پھر اور کوئی بحث نہیں کی۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اور پھر خاموشی سے انتہائی عقیدت سے دستو لینوری کے پاؤں کی خاک اپنی پیشانی سے لگا کر آہستہ آہستہ وہاں سے باہر نکل آئے۔

جس وقت وہ اپنے گھر پہنچے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ان کی کوٹھری میں مشرق کی طرف جو کھڑکی تھی، وہ کھلی تھی۔ اسی کے سامنے کھڑے ہو کر وہ خاموش آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک کسی بچے کی آواز سنکر چونک کر منہ پھیرتے ہی انہوں نے دیکھا کہ رما کا چھوٹا بھائی جانندر دروازے کے باہر کھڑا پکار رہا ہے "چھوٹے بھیا۔ چھوٹے بھیا!"

شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ رتیش نے قریب جا کر ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اندر لا کر پوچھا "جانندر! کیسے پکار رہے تھے؟ پکارو"

"مجھے؟ مجھے چھوٹے بھیا کہہ کر پکارنے کے لئے تم سے کس نے کہا؟"

"بہن نے"

"بہن نے؟ کیا انہوں نے تمہیں مجھ سے کچھ کہنے کے لئے بھیجا ہے؟"

جستندر نے سر ہلا کر کہا "نہیں بہن نے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ چھوٹے بھیا کے یہاں لے چلو۔ وہ وہاں کھڑی ہیں"

یہ کہہ کر جستندر نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ رمیش نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا کہ رتنا ایک کھمبے کی آڑ میں کھڑی ہے۔ اس کے قریب جا کر انہوں نے نرم لہجے میں کہا "آج میری قسمت بڑی تیز ہے۔ لیکن تم نے مجھے ہی کیوں نہ بلا بھیجا۔ خود یہاں تک آنے کی تکلیف کیوں کی؟ آؤ اندر آ جاؤ"

رتنا نے پہلے تو کچھ ادھر ادھر دیکھا اور پھر جستندر کا ہاتھ پکڑ کر رمیش کے پیچھے پیچھے جا کر ان کے دروازے کی چوکھٹ کے پاس بیٹھ گئی۔ پھر کہا "آج میں ایک چیز کی بھیک مانگنے کے لئے آپ کے گھر آئی ہوں۔ کہئے دیں گے؟"

یہ کہہ کر وہ رمیش کے چہرے کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ سے رمیش کے ساز دل کے تمام تار گویا اچانک زخمہ کی چوٹ سے جھنجھنا اٹھے۔ اور پھر ایک دم ٹوٹ کر بکھر گئے۔ کچھ ہی لمحے پہلے ان کے دل میں جو رنگا رنگ خواہشیں تمنائیں آرزوئیں اور امیدیں مستانہ وار رقص کر رہی تھیں۔ وہ سب یکدم بجھ گئیں۔ سب پر گویا اوس پڑ گئی۔۔۔ ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ پھر بھی پوچھا "کہو کیا چاہتی ہو؟"

ان کا وہ غیر فطری خشک لہجہ رتنا سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ وہ ان کے چہرے پر اسی طرح نگاہ جمائے ہوئے کہا "آپ پہلے زبان دیں"

رمیش نے کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد سر ہلا کر کہا "یہ نہیں کر سکتا۔ [illegible] جو میں تم سے کوئی سوال کئے بغیر زبان دینے کی جو طاقت تھی وہ تم نے اپنے ہاتھوں تباہ کر ڈالی ہے"

رتنا نے مغموم ہو کر پوچھا "میں نے؟"

رمیش نے کہا "ہاں وہ طاقت تمہارے سوا اور کسی میں نہ تھی۔ رتنا [illegible] آج

میں تم پر ایک حقیقت کا انکشاف کرتا ہوں۔ تمہارا جی چاہے تو اس پر یقین کرنا جی چاہے نہ کرنا۔ لیکن اگر وہ چیز مر کر بالکل معدوم نہ ہوگئی ہوتی تو شاید میں تمہیں یہ بات نہ سنا سکتا۔"

پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا: "آج یہ بات بتا دینے میں میرے یا تمہارے نفع و نقصان کا ذرا بھی احتمال نہیں۔ اسی لئے آج تیار ہوا ہوں کہ اس وقت تک میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو میں تمہیں نہ دے سکتا۔ لیکن تم جانتی ہو کیوں؟"

رتنا نے سر ہلا کر کہہ دیا "نہیں!" لیکن اس کا دل کسی عجب آمیز خیال سے تڑپ اٹھا۔

رتیش نے کہا: "لیکن شکنتلا کا حزن نہ ملنا اور سنا دم بھی نہ ہونا بھی سمجھ لیا کہ محبت پرانے زمانے کی کوئی کہانی سن رہی ہوں۔"

رتنا نے درمیان ہی میں روکنے کی دل ہی دل میں بڑی کوشش کی۔ لیکن اس کا سر اس طرح جھک گیا کہ وہ اسے کسی طرح اوپر نہ اٹھا سکی۔ رتیش نے پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے نرم اور شیریں لہجے میں کہا: "میں تم سے محبت کرتا تھا۔ آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ویسی محبت شاید کبھی کسی نے کسی سے نہیں کی۔ لڑکپن ہی میں اپنی ماں کے منہ سے سنا کرتا تھا کہ تم دونوں کا بیاہ ہوگا۔ اس کے بعد جس دن میری امید بالکل ختم ہوگئی۔ خواب موہوم بن کر رہ گئی۔ اس دن میں رو پڑا تھا۔ اب بھی مجھے وہ دن یاد آتا ہے۔"

یہ سب باتیں پگھلے ہوئے گرم لوہے کی طرح رتنا کے کانوں سے دل تک پہنچ کر سے جانے لگیں۔ ایک عجیب غیر محسوس تیز اور ناقابل برداشت مایوسی چھری بن کر اس کے دل و جگر کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگی۔ لیکن رتیش کو روکنے کا کوئی طریقہ اسے سمجھ میں نہ مل سکا۔ اس کے بعد پتھر کی مورتی

کس طرح خاموش بیٹھی رتیش کی زہر آمیز میٹھی باتیں سنتی رہی۔ رتیش کہتے گئے: "تم
یہ سمجھ رہی ہو کہ تمہیں یہ ساری داستان سنا کر ظلم ہو رہا ہے۔ بے انصافی ہے! میرے
دل میں بھی پہلے ہی شک تھا۔ اور اسی لئے اس دن تار کیشور میں جب تمہاری ایک دن
کی محبت اور عزت اور احترام سے میری تمام زندگی کی رفتار بدل گئی تھی۔ راہ بدل گئی تھی۔
تو بھی میں خاموش رہا۔ لیکن وہ خاموشی میرے حق میں اچھی نہ تھی۔

اب تم سے کسی طرح برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے کہا: "تو پھر آج ہی آپ مجھے
اپنے مکان پر لا کر اس طرح میری تحقیر و توہین کیوں کر رہے ہیں؟"

رتیش نے کہا: "توہین! بالکل نہیں۔ اس میں احترام یا توہین کی کوئی بات ہی نہیں
جن لوگوں کی یہ باتیں ہیں، ان کی تم تو کبھی بھی نہ تھیں، اور وہ رتیش بھی اب
نہیں رہا۔ خیر کچھ بھی ہو سنو ——— اس دن نہ جانے کیوں مجھے یہ پختہ یقین ہو گیا تھا
کہ تم خواہ کچھ کہو یا کچھ کرو، لیکن میری تباہی، میری بربادی، کسی طرح برداشت نہ کر سکو گی معلوم
ہوتا ہے۔ اس وقت سوچا تھا کہ اس لڑکپن میں ایک دن تم نے جو محبت کی تھی۔ اسے
شاید اب بھی سر سے بھول نہ سکی ہو گی۔ اسی لئے یہ سوچا تھا کہ تمہیں کوئی بات نہ بتا کر تمہارے
ہی سامنے میں مر کر اپنی زندگی کے تمام کام آہستہ آہستہ کئے جاؤں گا۔ لیکن اس کے
بعد اسی وقت جب میں نے خود اپنے کانوں سے سنا کہ تم نے خود ——— ارے باہر یہ اتنا
شور و غل کیسا ہو رہا ہے؟"

اتنے میں باہر سے گوپال سرکار نے بہت ہی گھبراہٹ میں کہا: "بابو جی!"
اور فوراً ہی رتیش باہر نکل آئے۔ گوپال سرکار نے کہا: "بابو جی، پولیس نے
بھیا کو گرفتار کر لیا ہے۔"

خوف کے مارے گوپال سرکار کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انہوں نے
بڑی مشکل سے کہا: "پچھلی رات کو رادھا نگر کی ڈکیتی پر وہ شان بتایا جاتا

ہے۔"

رتیش نے کمرے کی طرف دیکھ کر کہا: "رتنا اب تم ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرو۔ کھڑکی کے راستے باہر چلی جاؤ۔ پولیس مکان کی تلاشی لئے بغیر نہ چھوڑے گی . . . . کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ معاملہ کیا ہے اور کہاں تک پہنچ گیا ہے؟"

رتنا کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اسے یاد آگیا کہ اسی دن میں نے ہی تھانے میں اطلاع کروائی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ اچانک رونے لگی اور بولی: "میں نہیں جاؤں گی۔"

رتیش نے تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہ کر کہا: "نہیں نہیں رتنا! تمہیں اب یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ جلدی سے چلی جاؤ۔"

یہ کہہ کر رتنا کی کوئی بات سنے بغیر ہی جتندر رتنا کا ہاتھ پکڑ کر انہوں نے زبردستی ہی دونوں بھائی بہن کو کھڑکی کے راستے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا۔

---

(۱۳)

دو مہینے گزر گئے۔ ڈاکوؤں کے ساتھ بھجوا بھی حوالات میں بند تھا۔ اس دن تلاشی میں رتیش کے گھر سے کوئی مشتبہ چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ پھر تو اخبار پر نے شہادت دی کہ اس رات کو بھجوا میرے ساتھ میری لڑکی کے لئے ور دیکھنے گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بھجوا ضمانت پر رہا نہ کیا گیا۔ دینو نے آکر کہا: "میں رہا ہوں بہت سے داؤ پیچ سوچ کر مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ کیا دشمن کو آسانی سے نیچا دکھایا جا سکتا ہے؟
اس دن اپنے مالک کے حکم سے بھجوا جو لاٹھی ہاتھ میں لے کر محلے کا حصہ لینے

کے لئے گھر پر چڑھ آیا تھا۔ اصل بات اگر تم بھا نے بھی لکھنا سیکھی ہوتیں تو کیا آج وہ بدمعاش اس طرح حوالات میں بند کرایا جا سکتا؟ اور ہاں اگر تم ساتھ ساتھ دو چار باتیں اور بڑھا کر رتیش کا نام بھی شامل کر دیتیں تو پھر دیکھتیں تماشا! لیکن اس وقت تو تم نے میری کوئی بات ہی نہ سنی!"

رما کا چہرہ اتنا اتر گیا اسے دیکھ کر ونی بولے: "نہیں نہیں شہادت دینے نہیں جانا پڑے گا اور پھر فرض کرو کہ جانا بھی پڑے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے! شہادت دینی ہے تو پھر کسی بات سے پیچھے ہٹنے سے کام نہیں چلے گا۔"

رما نے کوئی جواب نہ دیا۔

ونی کہنے لگے: "لیکن رتیش تو آسانی سے قابو میں نہیں آ سکتا۔ اس بار اس نے بھی کوئی کم چال نہیں چلی۔ اس نے جو یہ نیا سکول کھولا ہے اس کے باعث ہمیں بڑی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ایک تو ویسے ہی مسلمان رعایا ہمیں اپنا زمیندار نہیں ماننا چاہتی اس پہ اگر وہ لوگ لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو پھر زمینداری کا رہنا یا نہ رہنا برابر سمجھو۔ یہ بات میں تمہیں ابھی سے بتائے دیتا ہوں۔"

زمینداری کے سب کام تو رما ونی ہی کے مشورے کے مطابق کرتی تھی۔ اس معاملے میں دونوں میں آج تک کبھی کوئی اختلاف پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن آج پہلی بار رما نے بحث شروع کی۔ بولی "مانا اس سے خود تمہیں بچا کر بھی تو کچھ نقصان نہ ہوگا!"

خود ونی کو بھی اس بارے میں کچھ کم کھٹکا نہ تھا۔ انہوں نے جو کچھ غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا تھا وہ بھی اس وقت بتانے لگے۔ کہا: "سارا کام ہو سب باتیں کیا جانو۔ اسے تو اپنے نقصان کی فکر ہی نہیں۔ ہم معزز آدمی پریشان ہو گئے۔ کہیں وہ خوش ہوا! دیکھ نہیں رہی ہو کہ جب سے آیا ہے کس طرح روپے لٹا رہا ہے۔ چاروں طرف چھوٹی ذات کے لوگوں میں "چھوٹے بابو" کے نام کا شور مچ گیا ہے۔ جیسے وہی

ایک آدمی ہے۔ اور ہم دونوں کوئی چیز ہی نہیں۔ لیکن یہ بہت دنوں تک نہ چلے گا۔ بہن! یہ جو تم نے اسے پولیس کی نگاہ پر چڑھا دیا ہے اسی سے وہ آخرکار ختم ہو جائیگا؟

ترینی نے دل ہی دل میں انتہائی حیران ہو کر دیکھا کہ اس گفتگو سے رتنا کے دل میں جوش اور جذبات پیدا ہونی چاہیئے۔ اس کا کہیں نام ہی نہیں۔ بلکہ انہیں معلوم ہوا کہ اچانک رتنا کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے۔ رتنا نے پوچھا، کیا رمیش بھیا کو یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ میں نے تھانے میں اطلاع کروائی تھی؟"

ترینی نے کہا، اچھی طرح تو نہیں جانتا۔ لیکن آخر اس بات کا پتہ تو لگ ہی جائیگا۔ جو اس کے مقدمے میں سب [illegible] کھل جائیگی۔"

اس پر رتنا نے اور کچھ نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ [illegible] بہت بڑے صدمے سے اپنے آپکو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ رہ رہ کر اس کے دل میں یہی آنے لگا کہ یہ بات رمیش سے پوشیدہ نہ رہیگی کہ انہیں مصیبت میں ڈالنے والوں میں میں ہی سب سے آگے ہوں۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔ کیوں بڑے بھیا، آج کل نوران کا نام سب لوگوں کی زبان سے سنائی دیتا ہے؟"

ترینی نے کہا، صرف ہمارے ہی گاؤں میں نہیں بلکہ سنا ہے دیس کی دیکھا دیکھی پانچ چھ اور گاؤں میں بھی سکول کھول لئے اور مدرسے بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آج کل چھوٹی ذات کے سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ صاحب لوگوں کے ملک میں ہر گاؤں میں ایک دو سکول ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے انہوں نے اتنی ترقی کی ہے۔ رمیش نے چاروں طرف یہ بات پھیلا دی ہے کہ جس جگہ نیا سکول کھلے گا۔ اس جگہ کے لئے میں دو سو روپے دوں گا۔ چچا جی سے [illegible]

ملے ہیں، وہ سب اپنی کاموں میں خرچ کر ڈالے تھا۔ مسلمان تو اسے کوئی پیر پیغمبر سمجھ بیٹھے ہیں۔"

رتنا کے بیٹے سے یہ بات ایک بار بجلی سی چمک کر نکل گئی کہ کاش وہ اس کے ساتھ مر جاتا نام بھی شامل ہو کر رہ سکتا! لیکن صرف لمحہ بھر کے لئے دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ تاریکی سے گھر گیا۔

دینی کہنے لگے: "لیکن تم بھی اسے آسانی سے نہ چھوڑ دیں گے۔ یہ بات کوئی جب میں بھی یہ سمجھ کر وہ ہم لوگوں کی ساری رعایا کو اس طرح آسانی سے ڈکار ڈالے گا۔ ہم زمیندار ہو کر بھی چپ چاپ آنکھ منہ بند کر کے دیکھتے رہیں گے۔ یہ کمبخت پیرا ہوا ہے اب کی بار مجھوا کی طرف سے گواہی دینے آیا ہے۔ اب میں دیکھوں گا وہ کس طرح اپنی لڑکی کا بیاہ کرتا ہے! ایک اور بھی ترکیب ہے۔ لیکن ذرا دیکھ لوں گھروند جا کر کہتے ہیں۔ ملک بھر میں ڈنکے تو بجتے ہی رہتے ہیں مگر اس بار اگر جیل بھیجے گئے تو پھر کسی معاملے میں اس کے ملک کر بھی جیل ہو جانے میں بھی زیادہ وقت نہ ہوگی۔ اور تم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ دشمن سادھو ہیں وہ بھی کمی نہ کریں گے۔ لیکن میں نے یہ خیال نہ کیا تھا کہ تمہاری بات اتنی درست ثابت ہوگی۔"

رتنا نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ دینی میں یہ سمجھنے کی طاقت نہ تھی کہ اپنے عقیدہ اور پیشین گوئی کے اس طرح حرف بحرف درست ثابت ہونے کی خبر پا کر بھی اس عورت کا چہرہ فخر و غرور سے چمک نہیں اٹھا۔ بلکہ گہری سیاہی میں چھپ گیا ہے۔ اس کے دل کی حالت کیا ہو گی تاہم یہ بات اتنی صاف تھی کہ کسی کی نگاہ سے اس کے بچنے کی توقع نہ تھی۔ ستیلی کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہ رہی۔ اس پر انہیں بے حد تعجب ہوا۔ انہوں نے رسوئی گھر میں جا کر ماں سے بھی دو چار باتیں کہیں اور پھر وہ اپنے گھر جا ہی رہے تھے کہ رتنا نے ہاتھ کے اشارے سے بلا کر نرم لہجے میں کہا: "کیوں بڑے

۱۲۱

سکے لیے سکول کھولنا اور پھر برہمن کا لڑکا ہو کر بھی سندھیا، پوجا وغیرہ کچھ نہیں کرتا۔
سنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ کا پانی تک پیتا ہے۔ چار ورق انگریزی کے پڑھ کر اب کیا
اس کا کوئی دھرم باقی رہ گیا ہے بہن۔ باطل نہیں! لیکن اس کی سزا گنتی کہاں ہے۔
جمع ہو رہی ہے۔ اور ایک دن سب کے سامنے آئے گی ہی!"

رتنا اور زیادہ بحث مباحثہ نہ کرتے ہوئے خاموش ضرور رہی لیکن رمیش کی
بے دھرمی کی بابت ادھر ادھر کی باتوں سے گنگا رانی کی بات یاد کر کے اس کا دل پھر ان
کی طرف سے متنفر ہو گیا۔ تو بھی اپنے آپ کچھ کہتے کہتے وہاں سے چل دیے۔ رتنا
پہلے تو کچھ دیر تک اسی طرح کھڑی رہی۔ اور پھر اپنی کوٹھڑی میں جا کر دھم سے
زمین پر بیٹھ گئی۔ اس دن اس کی ایکادشی تھی۔ آج کھانا پینا جھنجھٹ نہیں یہ سوچ کر
گویا اسے بڑا سکون و اطمینان حاصل ہوا۔

---

(۱۲۲)

برسات گزر گئی۔ آنے والی درگا پوجا کی مسرت اور ملیریا کا خوف بنگال کی دیہاتی
سرزمین کے آسمان میں ہوا میں ہر طرف چھا گئے تھے۔ رمیش کو بھی بخار آنے لگا۔
گزشتہ سال تو وہ اس راکشش کے حملہ کا مقابلہ کر کے بچ گئے تھے۔ لیکن اس
سال برداشت نہ کر سکے۔ متواتر تین دن تک بخار میں پڑے رہنے کے بعد آج صبح
ہی وہ اٹھے اور بہت سمجھ کر بھی نکل کر کھڑکی سے باہر زرد دھوپ کی طرف
دیکھتے ہوئے سوچنے لگے کہ گاؤں کے آس پاس جو پانی کے غیر ضروری گڑھے
ہیں اور جنگل جھاڑ جھنکار جمع ہو رہا ہے گاؤں والوں کو اس کے خلاف منظم
کیا جا سکتا ہے یا نہیں! ادھر لگاتار تین دن تک بخار میں مبتلا رہنے کے

باعث ان کی سمجھ میں اچھی طرح آگیا تھا کہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑیگا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر میں انسان ہو کر بھی چپ چاپ بیٹھا رہونگا۔ اور لوگوں کو اسی طرح ہر سال مہینوں ملیریا کی تکالیف برداشت کرنے دوں گا تو سیکڑوں اس کے لئے مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔ کئی دن پہلے اس بارے میں گاؤں والوں کے ساتھ بات چیت کرکے انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ گاؤں والے بھی اس سے ہونے والے نقصان اور ضرر سے بہت کچھ واقف ہیں۔ لیکن دوسروں کے گڑھے پاٹنے اور جھاڑ جھنکار کاٹنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے گھر سے کھا کر دوسروں کے کھیتوں کی رکھوالی دیکھتے ہیں۔ جن لوگوں کی اپنی زمین میں گڑھے اور جھاڑیاں وغیرہ تھیں وہ کہتے تھے کہ یہ سب ہمارا کیا ہوا تو ہے نہیں یہ تو ہمارے باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے۔ اس لئے جن لوگوں کو غرض ہو وہ ان گڑھوں کو پاٹ دیں اور جھاڑیاں وغیرہ صاف کردیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن ہم نہ تو اس کے لئے پیسہ ہی خرچ کرسکتے ہیں اور نہ محنت ہی کرسکتے ہیں۔ رمیش کو پتا لگانے پر معلوم ہوا۔ کہ پاس ہی پاس بہت سے ایسے گاؤں بھی ہیں۔ جن میں سے ایک گاؤں تو ملیریا کے باعث اجڑ گیا ہے اور اس کے قریب ہی کے دوسرے گاؤں میں ملیریا کا تقریباً نام و نشان بھی نہیں۔ اس لئے وہ سوچنے لگے۔ کہ ذرا طبیعت کے سنبھلتے ہی جاکر خود اپنی آنکھوں سے ایسے گاؤں کو دیکھوں گا اور وہاں کی حالت کی جانچ کرونگا۔ اور اس کے بعد اپنے فرض کا تعین کروں گا۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ جن دیہات میں ملیریا نہیں۔ وہاں بھی پانی کے نکاس کا ضرور کوئی قدرتی راستہ ہوگا۔ وہ راستہ بھی معمولی طور سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول نہ کرتا ہو۔ لیکن کوشش کرکے لوگوں کی توجہ اس طرف دلائی جاسکتی ہے۔ اور کچھ کم میرے منشا پیر ور گاؤں کی معصوم رعایا کی آنکھیں تو ضرور ہی کھل جائیں گی۔ جب انہیں اس بات کا دھیان آیا۔

کہ میری انجینئرنگ کی تعلیم کے کام آنے کا اتنے دنوں بعد ایک اچھا موقعہ آیا ہے اور وہ بھی ایک بہت ہی اہم معاملے میں، تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔

اتنے میں کسی نے روتی ہوئی آواز سے پکارا "چھوٹے بابو!"

رمیش چونک پڑے۔ انہوں نے گھوم کر دیکھا تو بھیرو آ رہا ہے زمین پر اوندھے منہ پڑے تھے اور عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انکی سات آٹھ برس کی ایک لڑکی بھی ساتھ تھی۔ اس نے بھی باپ کے ساتھ مل کر چیخ پکار سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ دیکھتے دیکھتے گھر کے سب لوگ دروازے کے پاس آکر اکٹھے ہو گئے۔ اور بھیڑ لگ گئی۔ رمیش نہ جانے کیوں ہکا بکا سے رہ گئے وہ کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکے۔ کہ کس سے پوچھیں ان کا کون مر گیا ہے۔ یا کیا نقصان ہو گیا ہے۔ اور کس طرح انہیں چپ کرائیں، انہوں نے قریب پہنچ کر جیسے ہی بھیرو کا ہاتھ پکڑ کر ذرا کھینچا وہ گر پڑا اور دونوں پاؤں کو پکڑ کر پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے رونے لگے۔ رمیش یہ خیال کرکے کہ یہ آدمی ذرا سی بات میں عورتوں کی طرح لگتا ہے۔ بے قرار ہو رہے تھے کہ گوپال کی ڈھارس بندھانے والی باتوں سے متاثر ہو کر آخر بھیرو آچاریہ آنکھیں پونچھ کر ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور اپنے ظلم و ستم کی داستان بیان کرنے لگے ان کا حال سن کر رمیش خاموش رہ گئے۔ وہ اس بات کا تصور بھی نہ کر سکے کہ اتنا بڑا ظلم بھی کبھی کہیں ہو سکتا ہے۔ بات یہ تھی کہ جب بھیرو کی گواہی سے مجبور ہو گیا تو اسے پولیس کی شبہ کی نگاہوں سے بچانے کے لئے رمیش نے اسے اس کے وطن بھیج دیا تھا۔ اس طرح ملزم تو کسی نہ کسی طرح چھٹکارا ہو گیا۔ لیکن اب گواہ جال میں پھنس گیا۔ جب بھیرو کو کسی طرح اپنی مصیبت کی خبر ملی تو وہ مل دوڑا ہوا صدر گیا اور وہاں اسے پتہ چلا۔ کہ پانچ چھ دن ہوئے سود ھانگ کے سنت مکر جی نے جو بینی کے سسر کے بھائی تھے۔ بھیرو کے نام سود اور اصل سب ملا کر

گیارہ سو چھبیس روپے ساڑھے سات آنے کی ڈگری کرالی ہے۔ اور اب ایک دن کے اندر اندر اس کے رہنے کا گھر قرق کر کے نیلام کر دیا جائیگا۔ اور یہ ڈگری یکطرفہ نہیں ہوئی بلکہ قانون کے مطابق اس کے نام سمن جاری ہوا۔ کسی نے بھیرو کے نام سے دستخط کر کے وہ سمن لے لیا اور اپنے آپ کو بھیرو بنا کر عدالت کے سامنے سب کچھ دینا منظور کر لیا۔ غرض یہ کہ قرض جھوٹا، مدعی جھوٹا اور مدعا علیہ بھی جھوٹا۔ اس طرح اس سرتاپا جھوٹ کی مدد سے ایک طاقتور آدمی نے ایک کمزور آدمی کا سب کچھ چھین کر اسے در در کا بھکاری بنانے کی کوشش کی۔ انصاف سرکاری عدالت میں ہے اس ظلم کے خلاف قدم اٹھانا بھی آسان نہیں۔ جب تک ڈگری کا سارا روپیہ عدالت میں جمع نہ کر دیا جائے اس وقت تک وہاں کوئی بات کہی ہی نہیں جا سکتی۔ اب سر پٹخ کر مر جانے پر بھی کوئی سچ بات نہیں سنے گا۔ لیکن غریب بھیرو اتنے روپے کہاں سے لائے جو عدالت میں جمع کرا کے اس ظلم و بے انصافی کے خلاف انصاف کی اپیل کر کے اپنی جان بچائے؟ ترکیا حکومت، قانون، عدالت، جج، مجسٹریٹ وغیرہ سب کے موجود ہوتے ہوئے بھی ایک غریب اور بے قصور کو سخت نقصان برداشت کرنا پڑے گا؟ اور اس میں کسی کو بھی شک و شبہ نہ تھا کہ یہ ساری کارروائی دھوکہ اور گورکھ دھندے کی ہے۔ اس ظلم کے باعث بھیرو کی حالت خواہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو جائے، محلہ کا ہر ایک شخص اس کا ساتھی اور اس سے ہمدردی رکھنے والا ہی اور اس سے متعلق خواہ کتنی ہی سرگوشیاں کیوں نہ کرتے ہوں لیکن ایک آدمی بھی ایسا نہیں نکلے گا جو سر اٹھا کر منہ کے سامنے مخالفت کر سکے۔ کیونکہ وہ لوگ کسی کے بیچ بچاؤ میں حصہ نہیں لیتے اور دوسروں کے معاملے میں کچھ کہنا سننا بھی انہیں پسند نہیں۔ اور خواہ کچھ ہو۔ لیکن رام رتیشور نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا کہ غریب رعایا پر ایسے عجیب ظلم کرنے کی جرات ان کو کہاں سے ملتی ہے۔ اور کس طرح ملک

کے قانون کو بھی لوگ قصائی کی چھری کی طرح کام میں لا سکتے ہیں۔ ایک طرف دولت کی طاقت اور دروغ بافی کی سمجھ انہیں جس طرح سزا سے بچا دیتی ہے۔ اسی طرح دوسری طرف مُردہ سماج بھی ان لوگوں کی بدکرداریوں کے لئے سزا کا کوئی انتظام نہیں کرتا۔ اسی لئے یہ لوگ ہزاروں بے انصافیاں اور ظلم کرکے بھی حقیقت سے محروم مردہ دیہاتی سماج کے سر پر پاؤں رکھ کر کسی خوف وخطر کے بغیر اپنی مرضی کے مطابق حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ آج انہیں تائی جی کی باتیں رہ رہ کر یاد آنے لگیں۔ اس دن انہوں نے غم آلود ہنسی ہنستے ہوئے کہا تھا ——

"رمیش! چولہے میں جائیں ذات پات کے یہ خیالات اور چھوٹا بڑے کے جھگڑے بکھیڑے۔ بیٹا! تم صرف چراغ دو، گاؤں کے لوگ اندھیرے میں اندھے ہو رہے ہیں۔ بیٹا! تم ایک بار ایسا انتظام کردو کہ یہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھ سکیں۔ سو وقت یہ خود بخود سیاہ و سفید میں امتیاز کرلیں گے۔ اور یہ بھی سمجھ لیں گے کہ اچھی بات کون سی ہے۔ اور بُری کون سی" انہوں نے یہ بھی کہا تھا "اگر تم یہاں آ ہی گئے ہو بیٹا۔ تو اب یہاں سے نہ جانا۔ تم لوگ منہ پھیرے رہتے ہو۔ تمہاری دیہاتی مادر وطن کی یہ حالت ہے۔"

ان کا کہنا سچ ہی تو ہے۔ امیرے چلے جانے سے تو حالت اور بھی بدتر ہو جاتی! اصلاح کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہتا!

رمیش نے ایک سرد آہ کھینچ کر دل ہی دل میں کہا "اُف! یہی ہمارے بنگال کا پاکیزہ، پُرسکون اور انصاف کا گھر دیہاتی سماج ہے! شاید کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا ہو جب اس میں جان تھی۔ اس وقت اس میں اتنی طاقت تھی کہ یہ ظالموں کو بدکرداروں کو سزا دیتا تھا اور اپنے سہارے جینے والے مردوں اور عورتوں کو آزادانہ زندگی بسر کرنے میں مدد دیتا تھا۔ لیکن آج یہ مردہ ہے۔ پھر بھی اندھے دیہاتی اس بھاری اور سڑی ہوئی لاش کو نہیں چھوڑتے اور اپنی محبت کے پیش

لے کر ایسے شوق اور محویت سے مختلف مقامات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے کہ
یہ بات تقریباً بھول ہی گئے کہ کل ہی بھیرو کے مقدمے کی تاریخ ہے۔ آج شام
کے وقت اچانک روشن چوکی ڈھول کی آواز سن کر وہ بات انہیں یاد آگئی۔ نوکر سے
یہ سنکر وہ حیران و ششدر رہ گئے کہ آج بھیرو اچاریہ کے لڑکے کا ان پراشن (بچے کا
پہلے دن اناج کھانا) ہے۔ پھر بھی انہیں اس کا پتہ نہیں! انہوں نے سنا کہ بھیرو
نے کچھ معمولی تیاری نہیں کی۔ انہوں نے گاؤں بھر کے سب لوگوں کو دعوت دی ہے۔
لیکن گھر کا کوئی آدمی یہ نہ بتا سکا کہ رمیش کو بھی کوئی دعوت دینے آیا یا نہیں۔ صرف
یہی نہیں، بلکہ اب انہیں یہ بھی یاد آیا کہ سر پر اتنا بڑا مقدمہ ہوتے ہوئے بھی بھیرو اچاریہ
ہیں پچیس دن سے ایک بار بھی نہیں آئے۔ یہ معاملہ کیا ہے؟ وہ فوراً دوپٹہ کندھے
پر ڈال کر سیدھے بھیرو اچاریہ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ باہر ہی سے انہوں نے دیکھا
کہ راستے کے ایک طرف گاؤں کے دو تین کتے جھوٹی پتلوں کے لئے لڑ رہے ہیں۔
پاس ہی روشن چوکی والے آگ سلگا کر تمباکو پی رہے ہیں۔ اور بعض اونگھ رہے
ہیں۔ اندر پہنچ کر دیکھا کہ صحن میں سینکڑوں جگہ سے پھٹا ہوا ایک شامیانہ کھڑا ہے اور
گاؤں بھر میں جو پانچ چھ بہت پرانی مٹی کے تیل کی لالٹینیں ہیں، مکرجی اور گھوشال
کے یہاں سے لاکر جلائی گئی ہیں۔ ان میں سے روشنی کم نکلتی ہے۔ اور دھواں زیادہ
اس دھوئیں سے وہ تمام جگہ بدبو سے بھر گئی ہے۔ کھانا پینا ختم ہو چکا ہے۔ مہمان زیادہ
نہیں رہ گئے۔ صرف چند ایک بیٹھے ہیں۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اور سرپنچ بھی "اب
جاؤں جاؤں" کر رہے ہیں۔ گووند گنگولی وہاں سے ذرا ہٹ کر ایک کسان کے
لڑکے کے ساتھ تنہائی میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہیں۔ عین اسی وقت رمیش
ایک بھیانک خواب کی طرح یکایک سب لوگوں کے سامنے صحن میں جا کھڑے
ہو گئے۔ انہیں دیکھتے ہی ان لوگوں کے چہروں پر جس طرح لمحہ بھر کے لئے

سیاہی دوڑ گئی ۔ فریق مخالف کو اس طرح یک جا دیکھ کر رمیش کا چہرہ بھی کچھ مسرور نہیں ہوا۔ کوئی بھی انہیں بیٹھنے کا کہنے کے لئے آگے نہیں بڑھا یہاں تک کہ کسی نے ایک بات بھی نہ کہی ۔ پھر تو خود وہاں نہ تھے ۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ "ہاں تو مدھو بھیا ......" کہتے ہوئے کسی کام سے باہر آئے تو گویا انہیں صحن میں بھوت کھڑا دکھائی دیا اور وہ تیزی سے لوٹ کر اندر چلے گئے ۔ جب رمیش سوکھے منہ سے اکیلے اس مکان سے باہر نکل آئے تو وہ حیرت کے مارے گویا کاٹھ ہو گئے ۔ اتنے میں انہیں سنائی دیا پیچھے سے کوئی پکار رہا ہے ——— "بھیا رمیش!"

رمیش نے پیچھے پھر کر دیکھا کہ دینو ہانپتے ہوئے چلے آ رہے ہیں ۔ قریب پہنچ کر انہوں نے کہا ۔

"چلئے بھیا جی ، گھر میں چلئے ۔"

رمیش نے ہنسنے کی کوشش کی ۔ لیکن ان کے منہ پر ہنسی نہ آسکی ۔ چلتے چلتے دینو کہنے لگے "آپ نے اس پر جو احسان کیا اس سے جو نیکی کی وہ اس کے ماں باپ بھی اس سے نہ کرتے ۔ یہ بات جانتے تو سب لوگ ہیں ، لیکن کیا کیا جائے کوئی چارہ جو نہیں بچے کچے لے کر ہی تو ہم لوگوں کو گرہستی چلانی پڑتی ہے ۔ اسی لئے اگر آپ کو مدعو کیا جاتا تو ——— سمجھ گئے نہ بھیا ! ——— بیچارے پھر کو بھی الزام نہیں دیا جا سکتا ۔ تم سب آج کل کے شہر کے رہنے والے لڑکے ٹھہرے ۔ ذات پات تو کچھ مانتے نہیں ۔ اسی لئے ——— سمجھ گئے نہ بھیا ——— اب اسکی چھوٹی لڑکی بھی گیارہ برس کی ہو چلی ۔ دو دن بعد اسے تو پار کرنا ہی پڑیگا ۔ بھیا ۔ ہم دیہات کے سماج کا حال تو جانتے ہی ہو سمجھ گئے نہ بھیا ۔"

رمیش نے بے چین ہو کر کہا ——— "جی ہاں اب سمجھ گیا ۔"

معلوم ہو گیا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ رمیش کے بدن پر ایک کرتہ تک نہ تھا۔ شام کی دھندلی روشنی میں ان کا چہرہ بھی اچھی طرح دکھائی نہ دیتا تھا۔ اتنے میں بھیرو کی بڑی لڑکی لکشمی ایک چھوٹے لڑکے کو گود میں لئے باہر نکلی۔ ایک اجنبی آدمی کو سامنے دیکھ کر اس نے ماں سے پوچھا: "ماں یہ کون ہے ؟"

لیکن اس کی ماں کوئی جواب نہ دے سکی۔ رمیش ابھی کچھ نہ بولے۔ لکشمی ڈر گئی۔ اور چلا اٹھی "بابوجی! نہ جانے یہ کون آدمی صحن میں آکر کھڑا ہے اور کچھ بولتا نہیں۔"

"کون ہے ؟" کہتے ہوئے اس کے باپ باہر نکل آئے۔ رمیش کو دیکھتے ہی گویا کاٹھ ہو کر رہ گئے۔ شام کی اس اداس روشنی میں بھی وہ نہیں پہچان سکے۔ رمیش کے معذور جسم کو پہچاننے دیر نہ لگی۔ رمیش نے تمارتے ہوئے کہا: "بھیرو آ گئے !"

اور پھر فوراً خود ہی آگے بڑھ کر بجلی کی سی تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ "ایسا کام کیوں کیا"

بھیرو رو پڑے ۔۔۔۔۔۔ "ارے او ظالم! ارے لکشمی جلدی گاؤں سے جاکر دینی بابو کو خبر دے۔"

ساتھ ہی سارے گھر بھر کے رونے پیٹنے کی صدا سے چلانے لگے۔ وہ ایک جھٹکے ہی شام کی اس خاموشی کو توڑنے والی بہت سے لوگوں کی رونے چلانے کی آواز سے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ رمیش نے زور سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا: "ارے پھر پیچھے یہ بتاؤ کہ یہ کام کیوں کیا ؟"

بھیرو نے ان کے سوال کا جواب دینے کی کوشش نہ کی۔ وہ صرف گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا رہا۔ اور رمیش کے ہاتھوں سے خود کو چھڑانے کے لئے کھینچا تانی کرتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں بھر کی عورتوں اور مردوں سے صحن بھر گیا۔

تماشا دیکھنے کے لئے وہ بھی ترچھے اکٹھے ہو کر اندر داخل ہونے کے لئے دھکم پیل کرنے لگے۔ لیکن جوشِ غضب میں رمیش نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا۔ سینکڑوں آدمیوں کی اشتیاق آمیز نگاہوں کے سامنے کھڑے ہو کر وہ پاگلوں کی طرح بھیرو کو پکڑے ہوئے اسی طرح جھٹکے پر جھٹکے دینے لگے۔ دیکھنے والوں نے رمیش کی جسمانی طاقت کی کہانیاں زبان زدِ خاص و عام تھیں۔ اس پر ان کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر اتنے آدمیوں میں سے کسی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ بدقسمت بھیرو کو چھڑا سکے۔ گووندلو اندر آتے ہی بھیڑ میں مل کر غائب ہو گئے۔ وہیں دور ہی سے جھانک کر کھسک جانا چاہتے تھے کہ بھیرو دیکھ کر رو پڑا "مجھے بچاؤ"

لیکن بڑے بابو نے اس طرف دھیان نہ دیا اور وہ پلک جھپکتے ہی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ سو بھاگ! اس بھیڑ میں سے ایک راستہ ہوا اور دوسرے لمحے فوراً ہی رتنا نے عاجزی سے وہاں پہنچ کر رمیش کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "بس ہو چکا اب چھوڑ دو"

رمیش نے اس کی طرف آتش ریز نگاہ سے دیکھ کر کہا "کیوں؟"

رتنا نے ہاتھ کھینچ کر غضبناک لہجے میں کہا "اتنے آدمیوں کے سامنے تمہیں ایسا کرتے شرم نہیں آتی۔ لیکن میں تو شرم کے مارے مری جا رہی ہوں!"

رمیش نے رتنا کی طرف دیکھ کر فوراً بھیرو کو چھوڑ دیا۔ اب رتنا نے نرم و نازک آواز سے کہا۔

"آپ گھر جائیے"

رمیش کچھ کہے بغیر وہاں سے باہر ہو گئے۔ مجمع ایک گویا اندر جال ہو کر کھیل سا ہو گیا لیکن ان کے چلے جانے پر رتنا کے متعلق ان کے اس احترام آمیز برتاؤ سے سب لوگ تعجب سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اور اتنی تھوڑی بات کا اس قدر شور

سے شروع ہو کر اس طرح ختم ہو جاتا کسی کو اچھا معلوم نہ ہوا!

لوگ چلے گئے۔ اب گوونا گنگولی نے سامنے آ کر ایک انگلی اٹھا کر اور اپنا چہرہ ضرورت سے زیادہ متفکر بنا کر کہا: "اب پہلے یہ مشورہ کرو کہ وہ جو گھر پر چڑھ آیا اور انہیں اس طرح ادھ موا کر گیا۔ اس کا کیا ہونا چاہیئے؟"

پھر دونوں گھٹنوں میں سر ڈالے بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ اس نے عاجزی سے دینی کی طرف دیکھا۔ دینا ابھی تک گئی نہ تھی۔ اس نے دینی کا ارادہ سمجھ کر جلدی سے کہا: "لیکن بڑے بھیا۔ اس طرف کا قصور بھی تو کچھ کم نہیں۔ ساندھ پر چڑھائی کیا ہے جس کے لئے کوئی کھیڑا کھڑا کیا جائے؟"

دینی نے اشتیاق تعجب سے کہا: "دیا! تم کیسی باتیں کرتی ہو۔"

پھر و کی بڑی لڑکی اس وقت بھی ستون کے سہارے کھڑی رو رہی تھی۔ وہ زخمی ناگن کی طرح یکدم گرج اٹھی۔

"دیا بہن! تم ہر کسی کی طرف سے بولتی ہی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر کوئی اس طرح تمہارے گھر میں گھس کر تمہارے باپ کو مار جاتا تو تم کیا کرتیں؟"

پہلے تو اس کی گرج شن کر دیا چونک اٹھی۔ وہ اگرا پنے باپ کی گھگو سیدھی کے لئے ستون نہیں تو نہ سہی، لیکن اس کی تیزی سے دیا کو بھی تیز آنچ لگی۔ وہ جل اٹھی پھر بھی ضبط کر کے بولی: "ہمارے باپ میں اور تمہارے باپ میں بہت فرق ہے۔ کالشی! اس لئے یہ مقابلہ نہ کرو۔ لیکن میں نے کسی کی طرف سے کوئی بات نہیں کہی میں تو سچ ہی کے لئے کہتی تھی۔"

کالشی دیہاتی عورت ٹھہری۔ وہ لڑنے جھگڑنے میں کسی سے کم نہ تھی۔ اس نے جھپٹ کر کہا: "ٹھیک ہے! تمہیں اس کی طرف سے لڑائی کرنے میں شرم نہیں آتی؟ بڑے گھر کی لڑکی ہو۔ اس لئے ڈر کے مارے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ کون

نہیں جانتا؟ نہیں ہو جو منہ دیکھا ہی ہو۔ کوئی اور ہوتے تو گلے میں پھانسی لگا لیتی۔"

ورینی نے لکشمی کو جھڑک کر کہا: "لکشمی خاموش رہو۔ ان سب باتوں کے کہنے کی ضرورت کیا ہے؟"

لکشمی نے کہا: "ضرورت کیوں نہیں؟ جس کی وجہ سے بابوجی نے اتنا دکھ پایا۔ اس کی لڑن سے پیار کروگی؟ اگر آج بابوجی مر جاتے تو؟"

دم بھر کے لئے رما خاموش رہا۔ لیکن ورینی کے اس بناوٹی غصے کے لہجے نے اسے گویا پھر غضبناک کر دیا۔ اس نے لکشمی کی طرف دیکھ کر کہا: "لکشمی! ایسے آدمی کے ہاتھ سے مرنا بھی خوش نصیبی ہے۔ آج اگر ہمارے بابو بچ جاتے تو سیدھے سورگ جا سکتے۔"

لکشمی نے اور بھی جل بھن کر کہا: "اسی لئے تو رما بہن تم اس پر مرتی ہو!"

رما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کی طرف سے منہ پھیر کر ورینی کی طرف گھوم کر پوچھا۔

"لیکن بڑے بھیا۔ یہ بات کیا ہے نہیں بتاؤ گے؟"

یہ کہہ کر وہ ٹکٹکی لگا کے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ گویا تاریکی کو چیر کر ورینی کے دل کے اندر تک دیکھنے لگی۔ ورینی نے ناراضی سے بھر کر کہا: "بہن۔ بھلا میں کیا جانوں؟ لوگ تو ایسی بہت سی باتیں کہتے ہیں۔ لیکن ان باتوں کی طرف دھیان دینے سے کام نہیں چلتا۔"

رما نے پوچھا: "لوگ کیا کہتے ہیں؟"

ورینی نے کہا: "کہتے ہیں تو کہا کریں۔ ان کے کہنے سے اپنا برا تھوڑا ہی نہیں جائے گا!"

اس فریب آمیز ہمدردی کو رما سمجھ گئی۔ اس نے تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا: "تمہارے جسم پر تو شاید کسی چیز سے بھی اپنے نہیں پڑ سکتے۔"

تاہم یہ بزرگ اتنے دکھی اتنے کمزور اور اتنے مفلس ہیں کہ ان سے ناراض ہو کر چپ چاپ بیٹھ رہنا بھی ناممکن ہے۔ باغی اور بدکرداری کی راہ پر چلنے والی اولاد کے متعلق ماں باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں رمیش کے دل میں بھی ویسے ہی جذبات اٹھ رہے تھے اور اسی لئے آج شام کو شام کو رمیش نے پیرپور کے نئے سکول میں پناہ لی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر ہوئی شام کی تاریکی کو دور کر کے چاندنی تمام گاؤں کے باہر کھلے میدان میں چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ رمیش اسی طرف دیکھتے ہوئے جانے کے لئے تیار ہو کر بھی نہیں جا رہے تھے۔ اسی وقت رما آکر ان کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وہاں روشنی نہ تھی۔ اسی لئے رمیش نے گھر کی طرف منہ کر کے کہا "کیا چاہتی ہو؟"

"کیا آپ باہر جا رہے ہیں؟"

رمیش چونک پڑے "کون رما؟ اس وقت کیسے آئیں؟"

جس لئے اسے شام کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اس کے کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن جس کام کے لئے وہ آئی تھی۔ اس کے متعلق بہت سی باتیں کہنی تھیں یا سنے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہی بات کس طرح شروع کرے۔ وہ خاموش تھی۔ رمیش بھی کچھ نہ کہہ سکے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد رما نے پوچھا۔

"اب آپ کی صحت کیسی ہے؟"

رمیش نے کہا "ابھی نہیں۔ اب بھی روز رات کو بخار ہو جاتا ہے۔"

رما نے کہا "تو کچھ دنوں کہیں باہر گھوم آئیے اچھا ہو گا۔"

رمیش نے ہنس کر کہا "جانتا تو ہوں کہ اچھا ہو گا۔ لیکن جاؤں کیسے؟"

یہ ہنسی دیکھ کر رما ناراض ہوئی۔ اس نے کہا "آپ کہیں گے کہ آپ کو بہت سے کام ہیں۔ لیکن ایسا کونسا کام ہے۔ جو اپنی صحت و تندرستی سے

بھی بڑھ کر ہو؟"

رتیش نے پہلے ہی کی طرح ہنس کر کہا: "میں یہ نہیں کہتا کہ اپنی صحت یونہی نظر انداز کر دینے کی چیز ہے۔ لیکن انسان کے لئے ایسے بھی کام ہیں جو جسم کی صحت سے بھی بہت بڑھ کر ہیں۔ لیکن رما! یہ تو تم نہ سمجھو گی۔"

رما نے سر ہلا کر کہا: "میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ لیکن آپ کو اور کسی جگہ جانا ہی ہوگا۔ آپ اپنے سرکار (گماشتہ) سے کہہ جائیں۔ میں ان کے کام کاج کی دیکھ بھال کر دوں گی۔"

رتیش نے حیران ہو کر کہا: "تم میرے کام کاج کی دیکھ بھال کرو گی؟ لیکن"

"لیکن کیا؟"

"رما، کیا تم جانتی ہو کہ میں تم پر اعتماد کر سکوں گا؟"

رما نے فوراً بے جھجک کہا: "دوسرا نہ کر سکیں۔ لیکن آپ کر سکیں گے۔"

اس کے پر اعتماد لہجے کی اس بات سے رتیش بے حد حیران ہوئے لیکن لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد بولے:-

"اچھا سوچوں گا۔"

رما نے سر ہلا کر کہا: "نہیں، سوچنے کا وقت نہیں۔ آج ہی آپ کو کسی اور جگہ جانا ہوگا۔ اگر نہ جائیں گے تو۔۔۔"

یہ کہتے کہتے ہی رما نے صاف محسوس کیا کہ رتیش بے چین ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ ابھی تک اس تجویز پر عمل نہ کرنے سے کیا مصیبت آ سکتی ہے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ رتیش نے ٹھیک ہی اندازہ کیا۔ لیکن خود کو سنبھال کر اپنی مجبوری کو قائم رکھتے ہوئے انہوں نے کہا: "اچھا، فرض کرو میں چلا گیا تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟ مجھے مصیبت میں ڈالنے کے لئے تم نے خود بھی تو کچھ کم کوشش نہیں کی۔ جتا جتا کر اور مصیبت سے خبردار کرنے آئی ہو۔ وہ سب واقعات ابھی اتنے پرانے نہیں

بیٹیا۔ اس کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ اندھیری رات نہیں۔ میں نہایت آسانی سے چلی جاؤں گی۔"

یہ کہہ کر کسی بات کا انتظار کئے بغیر رتنا آہستہ آہستہ باہر چلی گئی۔

---

(۱۶)

تما ہر سال بڑے ٹھاٹھ سے درگا پوجا کا تہوار منایا کرتی تھی اور پوجا کے پہلے ہی دن یعنی سپتمی کے روز گاؤں کے سب غریبوں اور کسانوں کو خوب جی بھر کے کھلاتی تھی۔ برہمن گھر سے ماتا کا پرشاد پانے کے لئے ایسی دھوم مچ جاتی تھی۔ کہ رات ایک پہر تک پتلی دونے اور جھوٹے برتنوں کی بھرمار سے گھر میں پیر رکھنے کی بھی جگہ نہیں رہتی تھی۔ صرف ہندو ہی نہیں۔ بیرپور کی مسلمان رعایا بھی کافی تعداد میں آتی تھی۔

اس بار بھی اگرچہ وہ خود بیمار تھی۔ اس لئے یہ انتظام کرنے میں کسر نہیں چھوڑی۔ چنڈی منڈپ میں پوجا وغیرہ کا سامان تھا۔ پیچھے میلہ کے لئے لمبا چوڑا صحن تھا۔

سپتمی کی پوجا وغیرہ وقت پر ختم ہو چکی تھی۔ دوپہر کے بعد آہستہ آہستہ تیسرا پہر بھی ختم ہونے کو آیا تھا۔ آسمان میں سانولی گھٹا پھیل کر آہستہ آہستہ نکلنے لگا تھا۔ لیکن گنگا کے مکان کا بڑا صحن تھوڑے سے بچے کھچوں کے سوا بالکل خالی سا ہی پڑا تھا۔ رات کو تھوڑا بڑے بڑے ٹھاٹھ سے ہو کر چلے گئے۔ لیکن ابھی تک کسی بھی کسان نے ماتا کا پرشاد لینے کے لئے گھر میں پیر نہیں رکھا۔ یہ چھوٹی ذات کے آدمی کھانے پہنچنے کا اتنا

بھی ہے جیسے بھڑک میں جلتا رہا ہوں۔"

رمیش کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کہیں اور کیا نہ کہیں اسی لئے وہ حیران و ششدر ہو کر دیکھتے رہے۔ ہیڈ ماسٹر پانڈے جی نے زمین پر لیٹ کر ڈنڈوت کر کے ان کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔ ان کے پیچھے چودھری تھے۔ ان میں سے کوئی آگے بڑھ کر آشیرواد دیتا تھا۔ کوئی سلام کرتا تھا اور کوئی پرنام۔ دینی کے آنسو کسی طرح رکتے ہی نہ تھے۔ انہوں نے محبت آمیز لہجے میں کہا: "بھائی! اب اپنے بڑے بھیا پر رد مٹے نہ رہو اور گھر چلو۔ یہاں تو دنی رتی اندھی بھی جا رہی ہیں۔"

سامنے گھوڑا گاڑی تیار کھڑی تھی۔ رمیش بغیر کچھ کہے چپ چاپ اس میں سوار ہو گئے۔ دینی نے ان کے سامنے کی نشست پر بیٹھ کر اپنے سر کی چادر اتار ڈالی۔ زخم خشک ہو جانے پر چوٹ کے نشان صاف دکھائی دیتے تھے۔ رمیش نے متحیر ہو کر پوچھا: "بڑے بھیا، یہ کیا ہوا؟"

دینی نے ایک لمبی سانس چھوڑ کر دایاں ہاتھ الٹ کر کہا: "بھائی! الزام کسے دوں؟ یہ سب میری ہی کرنی کا پھل ہے۔ اور میرے ہی پاپوں کی سزا۔ لیکن اب اسے سنکر کیا کرو گے؟"

دینی اپنے چہرے پر پھر حلم کی جھلک پیدا کر کے خاموش ہو رہے۔ خود ان ہی کے منہ سے نکلے ہوئے اس قسم کے اقبالی فقروں سے رمیش کا دل بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ کوئی واقعہ ضرور ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے معلوم کرنے کے لئے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ جب دینی نے دیکھا کہ جس بات کے لئے یہ طویل تمہید باندھی گئی تھی۔ وہ دینی دب جانا چاہتی ہے تو وہ دل ہی دل میں جھٹ پٹانے لگے۔ ایک دو منٹ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پھر ایک گہری سانس کے ذریعے رمیش کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

ان کے لوٹ آنے پر تمام گاؤں میں ایک اور سا شور سا ہو گیا۔ روزانہ صبح، دوپہر بعد شام کو بہت سے لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ اور طرح طرح کی باتیں کر کے ان سے انتہائی اخوت و محبت کا اظہار کرتے تھے۔ اپنے جیل میں رہنے کے متعلق جو نفرت ان کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سب دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں آس پاس کے تمام دیہات میں ایک بہت بڑا سماجی رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ سماجی تعلقات کا ہیئتیہ بننے لگا تھا۔ لیکن جب وہ اس بات پر غور کرنے لگے کہ ان چند ہی مہینوں میں اتنا بڑا تغیر کیونکر ہو گیا تو انہیں معلوم ہوا کہ زمینی کی مخالفت کے باعث جو طاقت قدم قدم پر رکا پڑا کام اچھی طرح نہیں کر سکتی تھی۔ وہی اب ان کی موافقت کے باعث دو چند جوش سے اپنا کام کر رہی ہے۔ آج انہوں نے زمینی کو کچھ اور بھی اچھی طرح پہچانا۔ سادی کو اس طرح بدکردار جان کر بھی گاؤں کے سب لوگ اس کی بات کس طرح مانتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے جتنی صاف آج دیکھی۔ ایسا پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک ایک کر کے سب آدمی انہیں یہ بھی بتا گئے۔ کہ ان پر جو ظلم ہوا ہے۔ ان سے جو بے انصافی روا رکھی گئی ہے۔ اس سے گاؤں کے سب لوگوں کو صدمہ پہنچا ہے۔ ان سب لوگوں کی ہمدردی اور زمینی کی حمایت حاصل کر کے مسرت اور جوش سے ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ان کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ چھ مہینے پہلے جن کاموں کو شروع کر کے ادھوری چھوڑ کر دینا پڑا تھا۔ اب پھر پوری طاقت سے انہیں مکمل کرنے کا فیصلہ کر کے رمیش خود بھی اس طوفان میں بہتے سب جگہ آنے جانے لگے اور سب باتوں میں لوگوں کی کھوج خبر لینے میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ صرف ایک ہی موضوع ایسا تھا۔ جس سے وہ پوری پوری کوشش کر کے اپنے آپ کو دور رکھتے تھے ——— اور وہ تھا رما کا ذکر۔ انہوں نے راستے ہی میں سن لیا تھا کہ رما بیمار ہے۔ لیکن انہوں

لیے یہ کبھی نہ جاننا چاہا کہ اسے کیا بیماری ہے۔ اور وہ بڑھ کر کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ میں نے اپنے آپ کو رتنا کے ہر قسم کے تعلقات سے چھٹکارا بالکل الگ کر لیا ہے بچکادوں میں آتے ہی انہوں نے لوگوں کے منہ سے سُن لیا تھا کہ صرف رتنا ہی ان کے سب دکھوں کی جڑ ہے۔ اسی سبب اس بارے میں بھی انہیں کوئی شک نہ رہا کہ رتینی نے جو کچھ کہا تھا۔ جھوٹ نہ تھا۔

پانچ چھ دن بعد رتینی نے رتیش کو گھیرا۔ بیرلوپر کی ایک بڑی جائداد کے بارے میں رتنا کے ساتھ بہت دنوں سے ان کا کچھ جھگڑا چلا آرہا تھا۔ اس اچھے موقعہ پر اس جائداد کو ہاتھ میں کر لینا ان کا مقصد تھا۔ دینی اور پہلے سے خواہ کچھ نہیں لیکن دل میں دہلتے ڈرتے تھے۔ لیکن اب وہ بیمار پڑی ہے۔ معاملہ مقدمہ کر نہ سکے گی۔ اور پھر ماں کی مہمان نوازی بھی رتیش کی بات ٹال نہ سکے گی۔ اسی لیے یہ سوچ کر کہ آئندہ چل کر کچھ بھی ہو اس وقت رتنا کے دخل کرنے کا اچھا موقعہ ہے۔ وہ رتیش سے صلاح کر بیٹھے جب رتیش نے اسے نامنظور کر دیا تو رتینی نے طرح طرح کے دلائل دینے کے بعد آخر میں کہا "تم سے یہ کام ہوگا کیوں نہیں ؟ اس نے تمہیں چھٹی میں پاکر تم سے کب رعایت کی ہے جو آج تم یہ سوچتے ہو کہ وہ بیمار پڑی ہے ؟ جب اس نے تمہیں جیل بھیجا تھا تو کیا تم کچھ کم بیمار تھے ؟"

بات بالکل درست تھی۔ رتیش اس سے انکار نہ کر سکے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ان کا دل رتنا کے خلاف جانے کے لیے رضامند نہ ہوا۔ رتینی کی ہزاروں تلخ اور پرجوش باتوں پر بھی جو انہیں یہ دھیان آتا تھا کہ رتنا اس وقت قابل رحم حالت میں ہے۔ تو ان کے تمام مخالفانہ جذبات کا سمندر سمٹ کر ایک معمولی قطرے میں سما جاتا تھا۔ اور اس کی کوئی وجہ انہیں ڈھونڈے نہ ملتی تھی۔ رتیش خاموش رہ گئے۔ یہ جان کر کہ اس سے کام نکلتا ہے۔ رتینی صبر بھی کرنا جانتے تھے۔ اسی لئے اس وقت اور زیادہ اصرار کرنے کی بجائے وہ چپ ہو گئے۔ اس بار ایک چیز نے رتیش کی توجہ اپنی طرف خاص طور پر

اپنی اپنی بات اچھی طرح سمجھا سکیں گے۔ لیکن عدالت میں تو ایسا نہ ہو سکے گا۔ اور پھر باپوجی ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جب تک وہاں وکیلوں کو مٹھی بھر روپے گرہ سے نکال کر نہ دیئے جائیں۔ اس وقت تک کام ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں ایک پیسے کا بھی خرچ نہیں۔ نہ تو وکیلوں کی خوشامد کرنی پڑے گی اور نہ عدالت تک دوڑ دوڑ کر پاؤں توڑنے پڑینگے۔ تو باپوجی، آپ جو حکم دیں گے۔ وہ خواہ اچھا ہو یا برا ہم لوگ مان لیں گے۔ اور آپ کے چرنوں کی دھول ماتھے پر لگا کر اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ بھگوان نے ہم لوگوں کو اب عقل دی ہے۔ اسی لئے عدالت سے لوٹ کر آپ کے قدموں میں آئے ہیں۔"

ایک چھوٹے سے نالے کے بارے میں ان دونوں کا جھگڑا تھا۔ اس معاملے میں جو کچھ معمولی سی دستاویزیں اور دوسرے کاغذ تھے۔ وہ سب انہوں نے رمیش کے سپرد کر دیئے۔ اور دوسرے دن صبح آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ رمیش خاموش بیٹھے رہے۔ یہ واقعہ ان کی حد تصور سے پرے تھا۔ انہوں نے مستقبل بعید میں بھی اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہ دی تھی۔ ان کا فیصلہ مانیں یا نہ مانیں لیکن آج یہ لوگ سرکاری عدالت سے باہر جھگڑا طے کرنے کے ارادے سے راستے سے لوٹ کر میرے پاس آئے ہیں۔ اسی ایک بات نے ان کے دل میں مسرت کا چشمہ جاری کر دیا۔ اگرچہ یہ کوئی بڑی بات نہ تھی گاؤں کے دو معمولی آدمیوں کا بہت ہی معمولی جھگڑا تھا۔ پھر بھی اس معمولی سی بات کی بنا پر ان کے دل میں کئی امکانات کے دلکش کنول کھلنے لگے۔ اپنی اس بدقسمت مادر وطن کے لئے مستقبل میں وہ کیا کیا نہ کر سکیں گے۔ اس کا کوئی حساب شمار ہی نہ کر سکے۔ باہر موسم بہار (بسنت) کی بڑ فزا ہوا سے فضا مہک رہی تھی۔ باہر کی طرف دیکھتے ہی اچانک انہیں رما کی یاد آ گئی۔ کوئی اور دن ہوتا تو یاد کے ساتھ ہی ان کے تمام جسم میں آگ سی لگ جاتی۔ لیکن آج آگ لگنا تو دور رہا۔ انہوں نے ذرا سی چنگاری کے وجود کا بھی احساس

نہیں کیا۔ انہوں نے دل ہی دل میں قدرے ہنس کر کہا: "رما، اگر نہیں یہ معلوم ہوتا کہ تمہارے ہاتھ سے بھگوان مجھے اس طرح کامیاب کریں گے۔ اور تمہارا زہر میری قسمت سے اس طرح امرت بن جائیگا تو میں سمجھتا ہوں کہ تم کبھی مجھے جیل بھیجنا پسند نہ کرتیں نے کون ہے؟"

"چھوٹے بابو، میں مہں رادھا۔ رما بہن نے آپ کو ایک بار ملاقات کر جانے کے لئے کہلوایا ہے۔"

رما نے ملاقات کرنے کے لئے کہنے کو خادمہ بھیجی ہے۔ ارمیش حیران و ششدر ہو کر دیکھتے رہ گئے۔ آج نہ جانے یہ کون دیوتا میرے ساتھ اس طرح کے انوکھے مذاق کر رہا ہے! خادمہ نے کہا: "چھوٹے بابو اگر آپ مہربانی کر کے۔۔۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"گھر ہی میں پڑی ہیں۔۔۔۔۔ کل تو پھر وقت نہ ملے گا اس لئے اگر اسی وقت۔"

"اچھا چلو چلتا ہوں۔" کہکر رمیش اٹھ کھڑے ہوئے۔

رمیش کو بلانے کے لئے نوکرانی کو بھیجکر رما ایک طرح سے چوکنی ہو کر بستر پر پڑی تھی۔ داسی کے کہنے کے مطابق رمیش کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ایک چوکی کھینچ کر بیٹھتے ہی رما نے جیسے صرف اپنے دل ہی کے زور سے اپنے آپ کو کھینچ کر رمیش کے پیروں کے پاس ڈال دیا۔ کمرے کے ایک کونے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ رمیش نے اس کی مدھم روشنی میں رما کی جو مبہم سی صورت دیکھی اس سے اس کی جسمانی حالت کے بارے میں انہیں کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ابھی راستے میں آتے آتے انہوں نے دل ہی دل میں جو کچھ سوچا تھا۔ رما کے سامنے بیٹھتے ہی وہ سب کچھ ذہن سے غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے شیریں لہجے میں پوچھا: "اب کیسی ہو رانی؟"

رما انکے پیروں کے پاس سے کھسک کر ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی اور بولی "آپ رما ہی کہہ کر پکارا کریں۔"

جس جائداد کا دخل حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ میری ذاتی ہے۔ یعنی اس میں سے پندرہ آنہ حصہ میرا ہے اور ایک آنہ آپ لوگوں کا۔ اسے میں آپ کے ہاتھ دے جانا چاہتی ہوں۔"

رمیش پھر گرم ہو گئے اور بولے "تم ڈرو نہیں۔ چوری کرنے میں میں نے پہلے بھی کسی کی مدد نہیں کی اور اب بھی نہیں کروں گا۔ اور اگر دان ہی کرنا چاہتی ہو تو اس کے لئے اور بہت سے لوگ ہیں۔ میں دان نہیں لیتا۔"

پہلے کا وقت ہوتا تو رتنا فوراً کہہ دیتی کہ کسی خاندان کا دان لینے سے گھروالوں کی عزت نہیں جاتی۔ لیکن آج اس کے منہ سے یہ الفاظ نہ نکلے۔ اس نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔ "رمیش بھیا۔ میں جانتی ہوں کہ آپ چوری کرنے میں مدد نہ دیں گے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر دان لیں گے تو اپنے لئے نہیں لیں گے۔ لیکن بات یہ نہیں۔ اگر کوئی قصور کرتا ہے تو اسے سزا ملتی ہے۔ جنہوں نے کوئی قصور کئے ہیں۔ انہیں کے جرمانے کی صورت میں اسے کیوں نہیں لے لیتے؟"

رمیش نے ہنستے ہوئے [illegible] جرمانہ وصول کیا ہے؟"

رتنا نے کہا "میں اپنے بیٹے کو آپ کے ہاتھ سونپتی ہوں۔ اسے اپنے ہی جیسا [illegible] بنا دیجئے [illegible] آپ ہی کی طرح جیتے جی [illegible] اپنا سب کچھ نثار کر سکے۔"

اب رمیش کے دل کی تمام شکایتیں [illegible] رتنا نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھ کر کہا۔ "یہ اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھ سکوں گی۔ لیکن یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ جس کی رگوں میں اس کے بزرگوں کا خون ہے۔ ایثار جس کا مادہ اس کے خمیر میں ہو [illegible] تعلیم و تربیت سے ممکن ہے۔ وہ بھی ایک دن آپ ہی کی طرح سر بلند کر کے کھڑا ہو سکے۔"

رمیش نے فوراً اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھڑکی کے باہر چاندنی سے روشن آسمان کی طرف دیکھتے رہے۔ ان کے دل میں ایک ایسا غم۔ ایسا

دور ہونا چاہتا تھا۔ جس سے وہ آج سے پہلے آشنا نہ تھے۔ بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد رتیش نے کہا: دیکھو ان سب باتوں میں اب بجھ نہ گیا ہوں۔ میں کئی قسم کے دکھوں اور مصیبتوں کے بعد روشنی کی ایک شاخ روشن کر سکا ہوں۔ سچ ہے خوف ہے کہیں وہ پھر نہ بجھ جائے؟

تنا نے کہا: نہیں رتیش بھیا۔ اب خوف کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی یہ روشنی اب نہیں بجھے گی۔ تائی جی نے کہا تھا کہ آپ نے بہت دور سے آکر بہت اونچائی پہ بیٹھ کر کام کرنا چاہا تھا۔ اسی لئے اس میں اتنی رکاوٹیں پیش آئیں۔ اب ہم لوگوں نے اپنی برائیوں کے بوجھ سے آپ کو نیچے جھکا کر ٹھیک مقام پہ بٹھا دیا ہے۔ اب آپ ہم لوگوں کے درمیان آکھڑے ہوئے ہیں۔ اسی لئے آپ کو خوف محسوس ہوتا ہے۔ پہلے ہوتا تو یہ شک دل میں جاگزیں ہی نہ ہوتا۔ اس وقت آپ ہمارے دیہاتی سماج سے باہر تھے۔ لیکن اب اسی کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ اسی لئے اب آپ کی یہ روشنی مدھم نہیں ہوگی۔ اب تو وہ روز بروز روشن تر، تیز تر ہوتی جائیگی؟

اچانک تائی جی کے نام سے رتیش بے حد متاثر ہوئے بولے: کیوں رما۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ اب میری جلائی ہوئی یہ شمع دور نہیں بجھے گی؟

رما نے استقلال آمیز لہجے میں کہا: ہاں میں خوب جانتی ہوں۔ یہ انہیں تائی جی کے منہ کی بات ہے۔ جو سب کچھ جانتی ہیں۔ یہ آپ ہی کا کام ہے۔ رتیش بھیا میرے جتندر کو اپنے ہاتھ میں لے کر اور میرے سب قصور معاف کر کے آج آپ مجھے آشیرواد دے کر رخصت کریں۔ تاکہ میں مطمئن ہو کر اپنے مالک کے پاس جا سکوں؟

رتیش کا دل بجلی سے بھرے ہوئے بادل کی طرح رہ رہ کر چمکنے لگا۔ لیکن وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ رما نے کہا: میری ایک اور بات آپ کو

ماننی پڑے گی۔ چلئے۔ مانیں گے ؟"
رمیش نرم لہجے میں بولے "کونسی بات ؟"
رما نے کہا "میری کسی بات کے متعلق بڑے بھیا سے کبھی جھگڑا نہ کرنا۔"
رمیش کچھ سمجھے نہیں۔ انہوں نے پوچھا "اس کا مطلب ؟"
رما نے کہا "اس کا مطلب اگر کبھی سُن سکو تو اس دن صرف یہی یاد کر لینا کہ میں کس طرح چپ چاپ یہ سب کچھ برداشت کر کے چلی گئی ہوں۔ کسی ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ ایک دن جب بالکل ناقابل برداشت معلوم ہوا تھا تو تائی جی نے آکر کہا تھا کہ بیٹی جھوٹ کو بار بار ہلا کر چھیڑنے رہنے سے اس کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ دینی غیر ضروری بات سے اس جھوٹ کی عمر بڑھا دینے کے برابر اور کوئی گناہ نہیں۔ ان کی یہی نصیحت یاد رکھ کر میں اپنی تمام مصیبتوں اور بدقسمتی کو کاٹ سکی ہوں۔ اور رمیش بھیا! تم بھی یہ بات کبھی نہ بھولنا۔"
رمیش چپ چاپ اس کے منہ کی طرف دیکھتے رہے۔ رما نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "رمیش بھیا، آج تم یہ خیال کر کے اپنے دل میں افسوس نہ کرنا کہ تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ آج جو بات دشوار معلوم ہوتی ہے وہی کسی دن سیدھی سادی اور آسان معلوم ہو گی۔ اسی لئے میرے دل میں آج کوئی غم نہیں کہ اس دن تم میرے تمام قصور نہایت آسانی سے معاف کر دو گے۔ میں کل جا رہی ہوں۔"
رمیش نے متعجب ہو کر پوچھا "کل؟ کہاں جاؤ گی ؟"
رما نے کہا "جہاں تائی جی مجھے لے جائیں گی وہیں۔"
رمیش نے کہا "لیکن میں نے سُنا ہے کہ اب وہ واپس نہیں آئیں گی۔"
رما نے آہستے سے کہا "میں بھی نہیں آؤں گی۔ میں بھی اب تمہارے قدموں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتی ہوں۔" یہ کہہ کر رما نے جھک کر پیشانی زمین پر

اب کہیں دوسرا جنم بھی اسی طرح جلتے جلتے نہ گزارنا پڑے۔ بس اسی خوف سے یہاں سے بھاگ رہی ہوں۔"

رمیش اس طرح بے حرکت کھڑے رہ گئے گویا اچانک ان پر بجلی گر پڑی ہو۔ ستر تائی جی کی اس ایک ہی بات سے رمیش کو معلوم ہو گیا کہ ان کے دل میں ماتا کی آگ کس طرح جل رہی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر انہوں نے پوچھا: "تائی جی! اب کہاں جا رہی ہو؟"

وشویشوری نے ایک گہری سرد آہ کو روک کر اور گلا صاف کر کے کہا: "بیٹا! دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسی لئے میں اسے بھگوان کے چرنوں میں لئے جا رہی ہوں۔ کہہ نہیں سکتی کہ وہاں جانے پر بھی وہ بچے گی یا نہیں۔ لیکن اگر کسی طرح زندہ رہی تو بس اسے زندگی بھر اسی بات پر غور کرنے کا موقع ملے گا کہ بھگوان نے جسے اتنا حسن، اتنی خوبیاں اور استعدادیں دے کر کیوں اس دنیا میں بھیجا تھا اور پھر کیوں کسی قصور یا جرم کے بغیر اس طرح اس کے سر پر مصائب کا بوجھ لاد کر اسے دنیا کے باہر پھینک دیا۔ بیٹا رمیش! اس دنیا میں اس سے بڑھ کر مصیبت زدہ شاید اور کوئی نہ ہو۔"

اتنا کہتے کہتے تائی جی کا گلا بھر آیا۔ انہیں اتنی زیادہ بے چینی ظاہر کرتے آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا۔ رمیش متعجب و ششدر رہ گئے۔ وشویشوری نے کچھ دیر بعد کہا: "رمیش! تمہارے سے میں ایک بات کہتی ہوں کہ تم کبھی اس کو غلط نہ سمجھنا۔ چلتے وقت میں کسی کی شکایت نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن تم کبھی بھول کر بھی میری اس بات پر شک نہ کرنا کہ اس سے بڑھ کر تمہاری خیر خواہ و خیر اندیش اور کوئی نہیں۔"

رمیش نے کہا: "تائی جی —"

"تائی جی نے بیچ ہی میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "رمیش! میں جانتی ہوں لیکن لیکن کچھ بھی نہیں۔ تم نے جو کچھ سنا ہے وہ سب جھوٹ ہے اور جو کچھ کہا ہے وہ سب غلط ہے۔ لیکن اب اس بحث اس بیان کو ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کا آخری

امر یہی ہے۔ کہ تم تمام بے انصافیوں اور ہر قسم کے مظالم اور رکاوٹوں کو سہتے ہوئے اپنے کام کو اسی زور شور سے جاری رکھنا۔ اسی لئے اس نے اپنا منہ بند رکھ کر سب کچھ برداشت کیا ہے۔ مد تیش! اس کی جان پر بنی ہے۔ پھر بھی اس نے منہ سے ایک بات بھی نہیں نکالی۔"

عین اسی وقت رتیش کو کل رات کی سدما کے منہ سے نکلی ہوئی ایک دو باتیں یاد آگئیں جس سے گویا طوفانِ گریہ ان کے ہونٹوں تک آ پہنچا۔ انہوں نے جلدی سے سر جھکا کر اور جسم کی تمام طاقت صرف کر کے کہا "تائی جی اس سے کہہ دینا کہ ایسا ہی ہوگا۔"

اس کے بعد رتیش نے ہاتھ بڑھا کر کسی طرح تائی کے قدموں کی خاک لیکر پیشانی پر لگائی اور تیزی سے باہر نکل گئے۔